قصّہ نصف صدی کا

یادداشتیں

اشرف عباس

قصّہ نصف صدی کا

یاداشتیں

اشرف عباس

maablib.org

اہتمامِ اشاعت

محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن (کراچی)

کتاب : قصہ نصف صدی کا

مصنف : اشرف عباس

کمپوزنگ : نوید سلطان جیوانی

طباعت : روزیٹ پرنٹرز (کراچی)

شہید اللہ بارے

تعداد : 1000

باراوّل : اگست ۲۰۱۸

قیمت : ۶۰۰ روپے

رابطہ : alkhamis_phk@yahoo.com

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

maablib.org

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ○

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

(القرآن)

maablib.org

صاحبِؐ اوّل و آخر کے نام

خَلق کی ابتدا محمدؐ ہیں

فکر کی انتہا محمدؐ ہیں

maablib.org

وَالْعُلَمَاءُ بَاقُونَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ أَعْيَانُهُمْ مَفْقُودَةٌ وَأَمْثَالُهُمْ فِي الْقُلُوبِ مَوْجُودَةٌ

صاحبانِ علم باقی ہیں جب تک کہ دہر باقی ہے اُن کے اجسام اگرچہ گم شدہ ہیں لیکن اُن کے عمل کی صورتیں دلوں میں موجود ہیں

(نہج البلاغہ)

maablib.org

انتساب

قبلہ گاہی منوّر عباس مرحوم کے نام

جن کی مجلسی تہذیب، علم دوستی اور سخن شناسی کے
قدر دانوں میں
حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت علامہ رشید ترابی
جیسی شخصیات کے اسمائے گرامی شامل ہیں

modablib.org

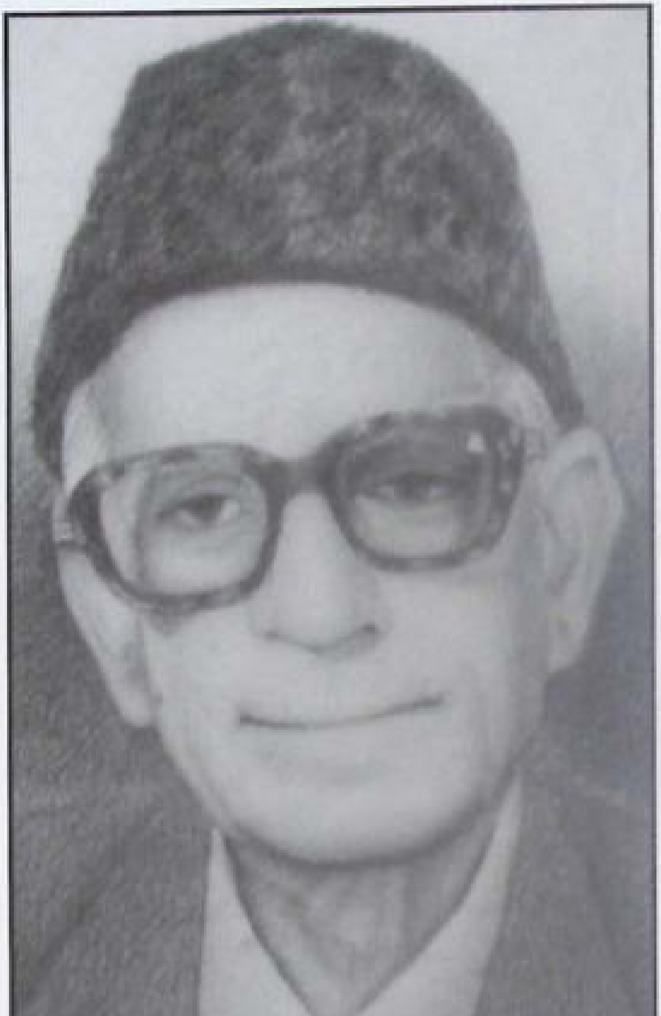

والدِ گرامی
مرحوم جناب منور عباس (ایڈووکیٹ)

قطعۂ تاریخ

حلقۂ جوشؔ و ترابیؔ کا نشانِ آخر
نقشِ خاک آج ہوئے حیف منور عباس
ایک تہذیب بہرطور درخشاں تہذیب
ایک تاریخ بہرکیف منور عباس

(نصیرؔ ترابی)

فہرست

علامہ رشید ترابی	اسمِ عظیم	12
اشرف عباس	اظہارِ حقیقت ، خاندانی پس منظر	17
ہادی عسکری	آواز کی دستک درِ اہلِ بیت پر	23
علامہ طالب جوہری	ایک رثائی آواز	30
علامہ رضی جعفر نقوی	گراں قدر یادداشتوں کا گلدستہ	31
نصیر ترابی	تہذیبیہ سرگزشت	33
افتخار عارف	فکرِ حسینی کی آواز	35
ڈاکٹر ہلال نقوی	آواز کی روشن قندیل	36
ظفر عابدی	عندلیبِ گلستانِ عزا	39
مشرف عباس	اظہارِ تشکر	40

مضامین 41

انجمن آرزو

شعر و شاعری سے رغبت

ابتدائے سلام خوانی

میرے چند واقعات و حالات

سلام خوانی کے ذیل میں چند واقعات
والد کی وفات
نصیحت

62 میری قربتیں
خطیب عالم اسلام حضرت علامہ رشید ترابی
شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی
حجتہ الاسلام مولانا محمد مصطفےٰ جوہر (طاب ثراہ)
علامہ طالب جوہری
مولانا حسن امداد
علامہ رضی جعفر نقوی
صادقینِ عظیم
مولانا پروفیسر تقی ہادی (شہید)
مولانا محمد علی نقوی
مولانا شہنشاہ حسین نقوی
ڈاکٹر سلمان ترابی

93 چند کرم فرماء، زعماء، محسنین
آغا قمر حسنین
شاہد نقوی
زاہد فتح پوری
معجز جونپوری
ڈاکٹر ہلال نقوی
نصیر ترابی

شہید پروفیسر سبطِ جعفر
حیدر ترابی
وحید الحسن ہاشمی
جعفر محسن
نجم الحسن جعفری
پرویز جعفری
علی ظہیر جعفری
انیس عباس رضوی
ظفر عابدی
سید محمد موسیٰ رضوی
سبطِ حسن زیدی
سید شوکت زیدی
اقبال حسین
قمر حیدر
میجر اعجاز مصطفےٰ
نثار مرحوم

110	تلخ یادیں
111	عظیم سعادت سفرِ عراق
114	عکس تحریر
120	میرے پسندیدہ کلام
140	تصاویر

اسمِ عظیم

علامہ رشید ترابی

maablib.org

اسمِ عظیم

علامہ رشید ترابی

کہتا ہے ہر دم قلبِ سلیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صرف آغاز نہیں ہے اُس کا نام

ہر انجام ہے وہ اسمِ عظیم

نام سے اُس کے خِلقت کا قیام

خلق کو جس نے دیا دینِ قدیم

عاجز کیا سمجھے آنِ قدیر

حادث کیا جانے شانِ قدیم

ہم ہیں مرکب اور وہ ہے صمد

ہم جاہل، ذات اُس کی ہے علیم

جس کا غضب بُعدعن الحق ہو

نعمت جس کی صراطِ مستقیم

منکرِ سجدہ، اب تک ہے وہ حُکم

دور بھی ہوا تنگ اَنتَ الرّجیم

اپنے گناہوں پہ ہے اب بھی مُصر

منکرِ صانع جو ہے فکرِ ذمیم

حد میں کیسے آئے وہ کلام

الکن بن جائیں جس جا کلیم

حاسد جل جل کر مٹی بنیں

جس کو چاہے دے ملکِ عظیم

آیا ہدایت کے لئے وہ نبیؐ

مومن کے لئے جو رؤف الرحیم

نورِ خدا جس کا ہے یاسین نام

جس کی سند والقرآن الحکیم

پائے کہیں اُس کو نہ فکرِ بشر

آ نے نہ ادراک میں جس کا حریم

دیکھ کے خاموش رہے وہ غفور

جان کے انجان بنے وہ کریم

ذکر نہیں کرتا ہے کوئی شقی

شکر نہیں کرتا ہے کوئی لئیم

اُس کا نہیں کوئی عدیل و نظیر

اُس کا نہیں کوئی شریک و سَہیم

لامحدود، حدوں میں کیا سمائے

ماہیّت میں کیوں آئے قدیم

فہم کا کیا حق پہنچے جو وہاں

عقل میں کیا آئے علیٌ حکیم

رازِ جہاں، نون و قلم قاف صاد

رمزِ جہاں، سِرّ الف لام میم

کلمہ اُس کا ہے وردِ زباں

جس کا دامن فردوسِ نعیم

نارو جناں سے نہ کیوں ہو اختلاج

بُغض تو محبت جہاں خود تقسیم

خُلق سے جس کے دلِ مومن قوی

کفر کا سَر ضَرب سے جس کی دو نیم

بدر و اُحد، خیبر و خندق میں ہے

نفس کا اُس کے وہ جلالِ عظیم

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مبین

بِسمِ اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم پہ نظر آپ کی ہے یا نہیں

قلبِ رشید اور اُمید و بیم

اظہارِ حقیقت

اشرف عباس

میں بہت انکسار اور افتخار کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ کراچی کی عزاداری کے حوالے سے اگر کبھی کوئی تاریخ ضبط تحریر میں لائی گئی تو یقیناً اس میں میرا تذکرہ ضرور شامل ہوگا اس لئے کہ مرکزی مجالس عشرہ میں مجھے سلام خوانی کا اعزاز برسہا برس سے حاصل ہے اور گزشتہ نصف صدی کے مناظر آنکھوں کے سامنے ہیں شاید اسی لئے طویل عرصہ سے میرے کچھ کرم فرما اور خیر خواہ مجھ سے شدید اصرار کر رہے تھے کہ میں اس تمام عرصے کے واقعات و حالات اور جملہ یادداشتوں کو مجتمع کر کے معرضِ تحریر میں لاؤں، ان حضرات میں چند مقتدر و محترم ہستیاں مثلاً مولانا حسن امداد مرحوم، مولانا حیدر ترابی مرحوم، حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ، جناب ڈاکٹر ہلال نقوی، انیس عباس اور میجر (ر) اعجاز مصطفیٰ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ شخصیات ہیں جن کی خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے لیکن میری بیماری اور پھر ایک ٹریفک حادثہ اس کتاب کی اشاعت میں تاخیر کا باعث ہوا۔

اب میں نے جو بھی یادوں کا ذخیرہ جمع کر لیا ہے اس کے لئے خالق کا شکر ادا کرنے کے لئے الفاظ فراہم کرنے سے قاصر ہوں میں عمر کے جس حصے میں ہوں عموماً لوگوں کا حافظہ اور یادداشت بالکل ختم نہ سہی، نہایت کمزور ضرور ہو جاتے ہیں لیکن رب العزت کا کرم اور نوازش ہے کہ میرے حافظہ میں آج بھی بہت سے واقعات تازہ اور محفوظ ہیں، اور میں ۱۹۶۳ سے ۲۰۱۷ تک کی عزائی رودادِ حیات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہا ہوں۔

میرے والد کی رہائش گاہ فیڈرل بی ایریا بلاک 20 میں قائم تھی اور حضرت علامہ رشید ترابی کے دولت کدے کی پشت سے متصل تھی، یہاں علماء، شعراء تشریف لایا کرتے تھے اور حضرت جوش ملیح آبادی تو برابر آنے والوں میں تھے، ہم نے برسوں ان کی زبانی اسی گھر میں ان کی لازوال شاعری سنی ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی بھی برسہابرس سے مجھ سے برابر یہ اصرار کرتے رہے ہیں کہ جوش صاحب سے وابستہ تمام یادوں، محافل اور مرثیوں کی مجلسوں کو ضبطِ تحریر میں لے آؤں، مجھے احساس ہے کہ جب میں لکھنے پر آمادہ ہوا تو ہزاروں مشکلات نے مجھے گھیر لیا جس میں ناسازی مزاج کا دخل بھی شامل ہے، میں یہ کام جس طرح احباب چاہتے تھے انجام نہ دے سکا - مگر پھر بھی حضرت علامہ رشید ترابی اور حضرت جوش سے متعلق میں نے ان یادوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے ہمیشہ فخر کیا ہے کہ شہر کی مرکزی مجالس میں جہاں معروف خطباء و ذاکرین زیب منبر ہوئے وہاں اساتذہ اور ہم عصر مداحان اہل بیت کا ہدیہ عقیدت میں نے لحن سے پیش کیا نہ صرف یہ بلکہ اس کی ابتداء مجھ سے ہوئی، اسی طرح اہم بات جو مجھ ناچیز کے لئے باعث فخر و مباہات ہے وہ یہ کہ میں ۵۶ برس کے طویل عرصے سے سرکار سید الشہداء کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کر رہا ہوں۔

مجھ سے اور میرے پیش کردہ کلام سے لوگ محبت اور قدر دانی کرتے ہیں یہی میرے لئے سرمایہء حیات ہے۔ میں اپنے ان تمام احباب کا دل کی گہرائیوں کے ساتھ شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے گراں قدر تاثرات سپردِ قلم کیے۔
دعا گو ہوں کہ رب العزت ان حضرات کو صحت و سلامتی و ترقی سے ہمکنار کرے۔

میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے ہزاروں مومنین کے لئے اظہار تشکر کا فریضہ بھی ادا کروں جنہوں نے ۲۰۱۴ء کے حادثہ میں جب میں شدید زخمی ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا تو مومنین کی دعائیں ہی میرے کام آگئیں اور میں روبصحت ہوا۔

میں محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن کے روحِ رواں ہادی عسکری کا صمیمِ قلب سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

اس ادارے کی بیش بہا گراں قدر علمی خدمات ہیں جو تمام تر غیر تجارتی بنیادوں پر مشتمل ہیں، اور نہایت شایانِ شان طریقہ سے کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، دفتر دبیر، شمارہ رثائی ادب، میر انیس، مرزا دبیر کا بارہ سو صفحات پر مبنی خصوصی شمارہ، معرکہ انیس و دبیر (ڈاکٹر نیر مسعود)، بزم انیس، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ مقالہ (ڈاکٹر ہلال نقوی) اذانِ مقتل مجموعہ مراثی (ڈاکٹر ہلال نقوی)، مولا علیؑ، مولا حسینؑ (مولانا کوثر نیازی) درخانہ اطہر (کرامت اللہ غوری)، دم بہ دم علی علی جیسی معیاری کتب کی اشاعت شامل ہیں۔

اسکے علاوہ اہم تحقیقی دستاویزی سفرنامے، سفر کربلا، نجف، شام، مشہد اور العرین (سرداب ابوالفضل عباس شامل ہیں، اور خصوصیت سے آواز کی صورت میں علامہ رشید ترابی کی بارہ سو تقاریر کا نایاب خزانہ محمدی ٹیپ بنک نے محفوظ کیا ہے اور عوام الناس اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ رب العزت ان تمام افراد کی سعی کو قبول فرمائے۔

اس موقع پر میں اپنے فرزند مشرف عباس کا ذکر دعاؤں کے ساتھ ضرور کروں گا کہ اشاعتی اور دیگر امور میں اپنی آراء سے رہنمائی کی، رب العزت صحت و عافیت سے رکھے۔

اشرف عباس

خاندانی پس منظر اور ازدواجی زندگی

1942	میں یوپی بھارت کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوا۔
1949	دسمبر میں کراچی ہجرت کر کے آ گئے۔عید گاہ میدان پر ایک بلڈنگ (جس میں اب صابری نہاری ہوٹل) ہے۔اس کی پہلی منزل پر رہائش اختیار کی۔
1962	یہ مکان چھوڑ کر ناظم آباد نمبر 2 نزد جامعہ امامیہ کے ایک مکان میں منتقل ہوئے۔
1966	فیڈرل بی ایریا بلاک 20 میں ذاتی مکان مکمل ہونے پر نقل مکانی کی۔
والد	جناب منور عباس ایڈووکیٹ ابن تجمل حسین (شہر کے صفِ اوّل کے وکیل)۔
والدہ	گھریلو خاتون۔
برادران	مظفر عباس (حالیہ مقیم کینیڈا)، صفدر عباس (مرحوم)، اطہر پرویز، اظفر عباس (مقیم کراچی)۔
ہمشیرگان	سرور جہاں مرحومہ، منور جہاں مرحومہ۔
عقد	1977 عیسوی میں ماموں کی صاحبزادی کے ساتھ کراچی میں ہوا 2012۔میں تقریباً بائیس برس بیمار اور صاحب فراش رہنے کے بعد اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔
اولاد	ایک بیٹا مشرف عباس عرف تابش 1979 کی پیدائش۔ ایک پوتا (محمد جری عباس ،عمر 12 برس ، پوتی زہرہ عباس) 7 برس۔

تعلیمی سرگرمیاں

1958	کراچی۔ گورنمنٹ بوائز اسکول کوتوال بلڈنگ سے میٹرک کیا۔
1960	ایس ایم آرٹس کالج سے انٹر کیا
1962	گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے بی۔ اے
1964	جامعہ کراچی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے
1965	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن سے بی ایڈ
1983	جامعہ کراچی سے انگریزی میں ایم۔ اے
1987	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن سے ایم۔ ایڈ کے امتحان میں پہلی پوزیشن لی

maablib.org

پیشہ ورانہ سرگرمیاں

1964	حسینی بوائز اسکول ناظم آباد میں بحیثیت استاد تقرری۔
1965	سرکاری ملازمت کا آغاز گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول سے ہوا
1975	جیکب لائنز اسکول سے تبادلہ گورنمنٹ کیپری ہنسو اسکول عزیز میں ہوگیا۔
1979	گورنمنٹ بوائز اسکول جیل روڈ میں ہوگیا۔
1982	خصوصی حکم نامے کے تحت ڈائرکٹریٹ آف اسکولز ایجوکیشن کے دفتر میں تبادلہ ہوگیا اور سالانہ مجلہ نکالنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اور اس کے ساتھ شہر بھر کے اسکولوں کے اسپورٹس کا انتظام اور نگرانی بھی میرے سپرد کردیا گیا۔
1988	گریڈ 17 میں ترقی ملی، اور گورنمنٹ سینئر ماڈل اسکول پی ای سی ایچ سوسائٹی میں ہیڈ ماسٹر بنا کر بھیج دیا گیا۔
1990	بورڈ نے پہلے جماعت نہم اور اس کے بعد دہم کا انگریزی کا پرچہ بنانے کی ذمہ داری سونپی۔ اسی سال گورنر سندھ نے چار سال کے لیے بورڈ کی تعلیمی کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔
2002	11 اپریل کو 37 سال سرکاری ملازمت مکمل ہونے کے بعد ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے چند ماہ بعد حبیب پبلک اسکول (پرائیویٹ) نے ملازمت کی پیشکش کی اور انگریزی کے ٹیچر کی حیثیت سے تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔
2005	حبیب اسکول سے استعفیٰ دے کر دوسرے ہی دن حیدری پبلک اسکول میں ملازمت اختیار کی اور 2006 تک بحیثیت استاد اور 2007 کے شروع میں چیف کوآرڈی نیٹر اور اسی سال کے وسط میں پرنسپل مقرر کیا گیا اور 2014 تک اسی عہدے پر فائض رہا۔
2005	ایک فلاحی تنظیم نے تفصیلی سروے کیا اور اس کی بنیاد پر اسکول اور کالج کے منتخب اساتذہ کو بہترین کارکردگی اور اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دینے کا اعلان کیا۔ اس شاندار تقریب میں مجھے طویل ترین علمی خدمات اور اعلیٰ کارکردگی پر "لائف ٹائم اچیومنٹ" ایوارڈ دیا گیا۔
2013	1980 سے 2013 تک علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کراچی ریجن میں بی ایڈ کو انگریزی کی تدریس کرتا رہا۔

آواز کی دستک درِ اہل بیت پر

ہادی عسکری
(بانی محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلیکیشنز)

عزیزان گرامی، قبل اس کے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں، ضروری سمجھتا ہوں کہ اسکا اعتراف کر لیا جائے کہ میں ایک ادنیٰ قاری ہوں، یہ میرے لئے فخر کا موقع ہے کہ جناب اشرف عباس صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے تاثرات سپردِ قلم کر رہا ہوں اگر قبول نہ ہوں تو نظرانداز کر دیجئے گا۔

رب العزت، کی ہزار نعمات میں سے ایک نعمت آواز ہے، اُس کی تخلیق کردہ ہر شہ آواز رکھتی ہے جن میں انسان، جانور، چرند، پرند، شجر شامل ہیں۔ مگر ہمارے کان انکی آواز کو سننے سے قاصر ہیں قرآن شریف میں ہمیں اسکی صراحت ملتی ہے۔

یہ جو رواں دواں ہیں پرندوں کی ٹولیاں
کھولے ہوئے فضا میں ہیں لہجوں کی جھولیاں
جو شے ہے کائنات کی مشغولِ ذکر ہے
اِدراک میں نہیں ہیں ہمارے یہ بولیاں

انسان کا شعور نہیں، مستعد ابھی
تشریحِ کُن سے دُور ہے چشمِ خرد ابھی

آواز کو کائنات سے منفی کر دیا جائے تو اسکی خلق کی ہوئی تمام اشیاء خاموش ہو جائیں گی۔ اور سارا نظام ساکت اور بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اگر ہم طائرانہ نظر ڈالیں تو چڑیا کا چہچہانا، کوئل کا کوکنا، مینا کی آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، اسکے برعکس، کتے، الّو اور دیگر جانوروں کی آوازیں سماعت پر گراں گزرتی ہیں۔ انسانوں میں بھی ہر وہ آواز جسکا تعلق فنون لطیفہ یا رثائیات سے ہو یا ہماری اصناف عزا سے ہر معیار پر پوری نہیں اترتی؟

آج جس آواز کا ذکر ہے اس کا تعلق ہماری عزا سے ہے یہ اشرف عباس صاحب کی آواز ہے سلام خوانی کے ذیل میں ایک پرسوز، لوچ اور گداز سے بھرپور، درد سے پُر اثر آواز ہے، جو اعلیٰ معیاری کلام آپ نے پیش کیا اس نے آپکی آواز و کلام کو شہرہ آفاق بنا دیا۔ آپ نے اپنی آواز کو صرف اور صرف ثناء خوانی ختمی مرتبت احمدِ مصطفیٰ ﷺ اور اہل بیت کیلئے وقف رکھا، آواز و کلام کو یکجا کر کے اسکا بھرپور معنوی فائدہ عوام الناس تک پہنچایا،

آواز کا یہ حُسن، یہ رطبُ اللّسانیاں
یہ علمِ صوتیات میں پنہاں، روانیاں
محور ہیں ساعتوں کے بسرِ حلقۂ قیود
ہر لحہ بولتی ہیں مقید کمانیاں

ان بندشوں میں بھی مسلسل رواں رہی
آواز ہر لباس میں گویا عیاں رہی

آپ ناسازی مزاج اور دیارِ غیر میں رہنے کے باوجود آج بھی خلوص سے خدمت انجام دے رہے ہیں، اور خصوصیت سے نشتر پارک میں تواتر کیساتھ ۵۶ برس سے بغیر ایک دن کے ناغہ کے سلام خوانی فرما رہے ہیں۔

پہلا سلام آپ نے ۱۹۶۳ میں خالقدینا ہال میں عشرہ اول کی مجالس کے دوران علامہ رشید ترابی کے حکم پر پڑھا، اس سے قبل سلام خوانی کا مجالس میں رواج نہ تھا، لہٰذا یہ سہرا آپکے سر رہا، آپ نے اپنے الدگرامی جناب منور عباس مرحوم کا مشہور سلام پیش کیا جسکا مصرعہ ہے

کبھی فرطِ ادب میں اشک افشانی نہیں جاتی
ہیں لب خاموش لیکن مرثیہ خوانی نہیں جاتی

یہ بھی ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ تقسیم ہند و پاک کے بعد پہلا عشرہ علامہ رشید ترابی نے ۹صفر ۱۹۴۷ خالقدینا ہال میں پڑھا تھا (حوالہ: ترابی کی کہانی ترابی کی زبانی) جناب اشرف عباس صاحب نے بھی پہلا سلام ۱۹۶۳ میں پیش فرمایا تھا۔

یہ ہماری سعادت ہوگی کہ ہم جناب اشرف عباس صاحب کو انکی حیات میں کتاب کی صورت میں نذرانہ پیش کریں اور علامہ رشید ترابی سمیت تمام مرحومین خطبا اور شعراء کو ایصال ثواب کا ذریعہ بھی ہو جائے۔

جناب اشرف عباس صاحب ۱۹۶۳ سے آج تک مسلسل سلام خوانی میں مصروف ہیں نشتر پارک ہو یا دیگر مقامات اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ (استثنا کے ساتھ) آپ کو ہر عزاخانے میں سلام پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔

آواز کے حوالے سے جناب ضیاء محی الدین صاحب کہتے ہیں کہ بے شک یہ اللہ کا انعام ہے مگر اسکے ساتھ خود انسان کو ادراک ہونا چاہیئے کہ اللہ نے اسکو اچھی آواز کی نعمت سے نوازا ہے آواز مشق و محنت چاہتی ہے تا کہ اسکو مزید پُر اثر بنانے کیلئے چاشنی پیدا کی جائے، اس میں انسان کی محنت و لگن کا بڑا دخل ہے، ان مراحل کے بعد ہی آواز سماعتوں میں قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

رب العزت کے شکر کے بعد مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ میں پہلا شخص ہوں جس نے ایران، عراق، شام کے تحقیقی دستاویزی سفرنامے سفر کربلا، سفر نجف، سفر شام، سفر مشہد اور الحرمین ۲۰۰۱ اور ۲۰۰۳ کے درمیان میں پاکستان ٹیلی ویژن کو ہدیہ کیے تھے، اور پس پردہ آواز کیلئے جناب ضیاء محی الدین کو منتخب کیا تھا جو انکی مذہبی پروگرام میں پہلی پس پردہ آواز ہے۔

جب میں اُنکی آواز کو محفوظ کر رہا تھا تو وقفے کے دوران گفت و شنید بھی ہوتی تھی آپ کہتے ہیں آواز کا کوئی پیراہن نہیں ہوتا، ہر لفظ کے اندر اُسکا احساس پنہاں ہے، آواز ہی اس لفظ کو اُجاگر کرتی ہے، یہ جب ہوتا ہے کہ بولنے والا خود بھی اس لفظ کی گہرائی اور گیرائی سے پوری طرح آگاہ ہو تب کہیں اُسکا عکس آواز کی صورت میں اثر پذیر ہوتا ہے، اور اسکے لئے زبان کا علم رکھنا بھی بے حد ضروری ہے، ورنہ ایسی آواز بھینس کے آگے بین بجانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں، اس کا اندازہ آج بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

لہجے میں جب حروف کی مُجرہو نہ ڈھل سکے
سانچے میں ایک جھول رہا قد نہ ڈھل سکے
آواز نے بہم نہ کیا جب تلک انہیں
اِک مجتمع وجود میں ابجد نہ ڈھل سکے

بکھرے جو حرف سطر کی دھجی بکھر گئی
ساری صفِ حروف تہجی بکھر گئی

جناب ضیاء محی الدین کے مطابق ہم جناب اشرف عباس صاحب کی آواز کو سنیں تو معلوم ہوگا کہ آپکی آواز کو ان تقاضوں کے تحت پرکھا جاسکتا ہے۔ جناب اشرف عباس صاحب اور سید ناصر جہاں صاحب میں پڑھنے کے حوالے سے کئی چیزیں مشترک نظر آتی ہیں مثلاً منبر پر نشست و برخاست، چشم و ابرو کی جنبش، آغاز سلام سے قبل شاعر کا نام بتانا، پڑھتے وقت ہاتھ پیر کا نہ ہلانا، چہرے پر اُتار چڑھاؤ کا بگاڑ نظر نہ آنا اور بے انتہا مشکل بحروں کو با آسانی اور سادگی سے ادا کرنا کہ سننے والے کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اور پھر آپکا حافظہ، آواز، معیاری کلام اور خلوص کے چاروں اجزاء نے ملکر ہی آج سماعتوں میں آپکی آواز و کلام کو قبولیت کے درجے پر فائز کیا ہے۔ آج الحمد اللہ ۷۵ برس کی عمر میں بھی سامعین کو آپکی آواز میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

کلام کے چناؤ میں آپ حد درجہ محتاط نظر آتے ہیں معیاری اور اساتذہ کے کلام کو آپ نے ہمیشہ پیش کیا ہے۔ ہمارے سوز خواں، سلام گزار، تحت اللفظ مرثیہ پڑھنے والے حضرات نے اساتذہ کے کلام کو روشناس کرنے میں بڑا حصہ ہے، مثال سے بات واضح ہو جائے گی کہ " گھبرائے گی زینب" ہندو شاعر کا اور " سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا " سید آلِ رضا صاحب کا کلام ہے، اگر سید ناصر جہاں ان شعراء کے کلاموں کو پیش نہ کرتے تو عوام الناس تک رسائی کا کیا ذریعہ ہوتا؟ بالکل اسی طرح سے مولانا حسن امداد کی مشہور و معروف نظم تقدم ولدی اگر جناب اشرف عباس صاحب پیش نہ کرتے اور دیگر کلام قبول و مقبول کیسے ہو سکتے تھے، یہ کلام صرف کتابوں کی حد تک محدود رہتے مگر ان حضرات نے ان کے کلاموں کو پڑھ کر حیات دائمی بخش دی۔

" اوراب تو بعض پڑھنے والوں کی بے خبری کا یہ حال ہے کہ ایک نوحہ خواں سے کہا کہ آپ میر انیس کا کلام پڑھا کرو انکا جواب تھا میر انیس کراچی میں ہیں یا لاہور میں رہتے ہیں؟؟؟"

جناب اشرف عباس صاحب نہ صرف سلام گزاروں میں اپنا منفرد اور جداگانہ مقام رکھتے ہیں بلکہ اسکے ساتھ ہی

آپکی شخصیت میں شرافت، اخلاقیات، انکساری، شفقت و محبت، کم گوئی، صبر رواداری، انسانیت کی خدمت حد درجہ موجود ہیں۔ آپکی آواز و کلام کی قبولیت کے ذیل میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قبولیت کا راز تا جرانہ مشق سے دوری ہے اس میں آپ کے والد گرامی کی نصیحت و وصیت کا بنیادی دخل ہے۔

صاحب عزاء کی دعوت پر فوری لبیک کہنا اگر دامن وقت میں گنجائش ہے حد یہ ہے کہ آمد و رفت بھی خود اپنے ذمہ، وقت پر پہنچنا اور سلام پڑھنے کے بعد ذاکر دوئم کو سننا یہ آپکا ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے اور یہی فرش عزاء کا تقاضہ بھی ہے۔

اہم ترین شے آپ کی سرکار سید الشہداء کے ساتھ بے پناہ محبت خلوص و اخلاص، عقیدت کا دخل ہے اور آپ اس عملی مظاہرہ سے گزرے بھی ہیں، شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں عشرہ اوّل کے دوران ۹ محرم کو آپ کی والدہ گرامی (منور عباس صاحب کی اہلیہ) اور آپکی دختر کا ایک ہی دن انتقال ہو گیا تھا، دوسرے دن عاشور تھا اور صبح آپ نے سلام پڑھنا تھا اور پڑھا، کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ آپ اس سانحہ سے دوچار ہیں، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے پیش نظر مادر حسین کے غم کے علاوہ کسی بھی دوسرے غم کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس عمل سے نتیجہ اخذ ہوا کہ ذکر سید الشہداء کیلئے قبولیت کا دارومدار صرف اور صرف خالصتاً اور عملاً اپنی ذات کی نفی میں ہے اور یہی شرط اوّل ہے، اس میں ادارہ، تنظیم، ذاتی تشہیر، تجارتی لین دین کی مشقیں اگر شامل ہیں

وہ ذکر حسین کے علاوہ سب کچھ ہے۔ اسی لئے مرحوم و مظلوم حضرت جوش ملیح آبادی نے کہا تھا

"خوف ہے قربانی اعظم نظر سے گر نہ جائے
ابن حیدر کے لہو پر دیکھ پانی پھر نہ جائے
ذہن میں آتا ہو جس کا نام تلواروں کے ساتھ
اس کا ماتم اور ہو سکتوں کی جھنکاروں کے ساتھ"

عزیز بھائیو یہ ہماری عزاء کے بنیادی رہنما اور مروجہ اصول ہیں ہمارے اجداد کا اثاثہ ہے اور عزا کی تہذیب ہے لیکن آج دیکھئے تو عجیب عالم ہے

القابات کو دیکھیں تو "اللہ اکبر وکیل ولایت علی" کیا امام علی کی ولایت اتنی کمزور ہے کہ گنہگار انسان آج اس کی وکالت کریگا؟ پھر نقیب ولایت علی ، بحر مصائب ، شہنشاہ مصائب ، مفسرِ قرآن ، سفیر سید الشہداء وغیرہ وغیرہ

ہمارے آئمہ اول اوسط آخر سب برابر ہیں مگر القابات کو دیکھیں امیر المومنین علی ابی ابن طالب ، سید الشہداء امام حسین ، امام زین العابدین آدم کربلا ، حضرت ابو الفضل العباس ، شہزادہ علی اصغر ، امام موسیٰ ابن جعفر باب الحوائج ہیں۔ یہ القابات صرف انہی ہستیوں کیلئے مخصوص ہیں ، کیا ہم امیر المومنین کو سید الشہداء کہہ سکتے ہیں ؟

عزیزو ، یہ القابات ذکر حسین کرنے والے کس طرح سے اور کیوں کر اپنے نام سے منسوب کر سکتے ہیں۔ یہ آئمہ کے القابات کا غیر ضروری استعمال امانت میں خیانت نہیں تو اور کیا ہے۔

علامہ رشید ترابی کو صدائے بلتستان محرم نمبر میں سفیر سید الشہداء لکھ دیا گیا تھا ، اس پر آپ بے حد برہم ہوئے اور تقریر میں فرمایا تھا یہ لقب صرف حضرت مسلم ابن عقیل کی ذات گرامی کے لئے مخصوص ہے مجھے کسی لقب کی ضرورت نہیں مجھے صرف رشید ترابی کے نام سے پکارا جائے ، اور جہاں یہ لقب لکھا گیا ہے میں آپ سے درخواست کرونگا کہ اس پر سیاہی پھیر دی جائے۔

آج منبر نشین شعراء نے بھی کوئی کسر باقی نہ رہنے دی اور اپنے ناموں کے ساتھ فرزدق ہند ، انیس ثانی ، شاعر انقلاب اور بغیر پی. ایچ. ڈی ڈاکٹر کے القابات کو جوڑ دیا ہے۔

سید ناصر جہاں مرحوم ہماری اسی تہذیب کا حصہ تھے اور آج اشرف عباس صاحب ہیں ، ان کی بنیاد میں ایک ہی فکر دامن گیر رہی کہ اہل بیت کے دروازے کے باہر جو دور سے صدا سلام کی صورت میں صدا بلند کر رہے ہیں وہ سید ناصر جہاں (مرحوم) ہوں یا اشرف عباس شرف قبولیت کا درجہ حاصل کر لے

بس۔۔۔ اور بس۔۔۔

محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن نے جہاں رثائی ادب کی برابر خدمت کی ہے وہاں بکھری ہوئی اور گمشدہ آوازوں کو بھی یکجا کیا ہے جن میں علامہ رشید ترابی کی ۱۲۰۰ تقریروں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور دیگر علمائے کرام کی تقاریر سوز خوانوں اور شعراء و اسکالرز کے انٹرویو کا سرمایہ موجود ہے، اس ذیل میں جناب اشرف عباس کی سلام خوانی ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۳ تک کم و بیش ۵۰ گھنٹے محفوظ ہے۔ یہ عوام الناس کے کیلئے مرحلہ وار محمدی ٹیپ بنک کے یوٹیوب چینل پر پیش کی جارہی ہیں۔

قصہ نصف صدی کا اشرف عباس صاحب کی یاداشتوں پر مشتمل کتاب ہے، اسکی اشاعت میں خلل واقع ہوا اور منظر عام پر آنے میں تاخیر ہوئی، آپ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ محمدی ایجوکیشن اس کتاب کو از سر نو پھر شائع کرے، میں نے بغیر کسی تعمل کے ان سے کہا کہ اول و آخر کتاب منظر عام پر آجائے گی، اس کتاب کی اشاعت ہمارے لئے باعث فخر ہوگی، یہ سلام خواں اہل بیت جو گزشتہ ۵۶ برس سے تسلسل سے سلام کی صدا اہل بیت کی دستک پہ بلند کررہا ہے ہم بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں، اشرف عباس صاحب کی یاداشتیں سلیقہ مندی سے اشاعت کے مراحل طے کرلیں اور عوام الناس تک پہنچ جائیں جو یقیناً موجودہ اور آنے والی نسل کیلئے جو سلام خوانی میں قدم رکھیں تو یہ یاداشتیں ایک موثر رہنمائی کا وسیلہ ثابت ہوں۔ (انشاءاللہ)

maablib.org

ایک رثائی آواز

علامہ طالب جوہری

آج کراچی کی عزاداری میں شریک ہونے والا ایسا کون سا شخص ہے جو جناب شرف عباس کے اسم گرامی سے واقف نہ ہو یا ان کی خدمات کا معترف نہ ہو۔ میں نے کراچی کا ذکر اس لئے کیا کہ موصوف کا بنیادی حوالہ یہی شہر ہے۔ ورنہ ابلاغ کے ذرائع ان کی آواز اور ان کے نام کو دنیا کے ہر اس مقام تک پہنچاتے رہے ہیں جہاں آل محمد علیہم لسلام کا چاہنے والا اردو داں طبقہ موجود ہے۔

ناصر جہاں مرحوم کی رثائی آواز کے علاوہ یہ دوسری زندہ رثائی آواز ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ رثائیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے لحن کا انتخاب جو رثائیت کو چار چاند لگا دے۔ اس کے ساتھ ہی لفظوں کی ایسی ادائیگی کہ سامع پر شعر کی مکمل ترسیل ہو جائے، شرف عباس کا وہ طریقہ ہے جو محافل، مشاعرے اور مجالس میں سلام خوانی تک ہر جگہ مرغوب و مطلوب ہے۔

کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں یہ معلوم ہوگا کہ وہ ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور مشق و مہارت نہ ہونے کے باوجود وقت ضرورت سلام کہہ لیتے ہیں۔ انہیں شعری مزاج وراثت میں ملا ہے ان کا گھر شعراٗ کا مرکز تھا۔ جہاں میں نے ذاتی طور پر انہیں اکابر شعراٗ کا کلام پڑھتے سنا ہے، کچھ واقعات ان کی تحریر میں بھی موجود ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چند سال قبل دبئ میں ان کی قیام گاہ پر میں نے ان سے اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی اور انہوں نے قبول بھی فرمایا تھا۔

اگرچہ موجودہ تحریر بھی ایک دلچسپ مواد کی صورت لئے ہوئے ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اشرف عباس صاحب کے سینے میں اس سے کئی گنا زیادہ مواد موجود ہے، ان کے صاحبزادے مشرف عباس اگر اسے مرتب کرا سکیں تو یہ ان کی سعادت مندی ہوگی۔

رجب ۱۴۳۸ ہجری

"گراں قدر یادداشتوں کا گلدستہ"

علامہ رضی جعفر نقوی صاحب

قوم وملت کی نہایت گرانقدر شخصیت، ہزاروں مجلس ومحافل کی زینت، شاعروادیب مسند نظامت کی گراں بہا ہستی، سلام کی دنیا کے تاجدار، نہایت ہردلعزیز اور گراں مایہ مدح خواں اہلبیت عالیجناب مکرم ومحترم اشرف عباس صاحب دام مجدہ، کو پروردگار عالم، صحت وعافیت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے۔

آپ کچھ عرصہ سے اپنے فرزند ارجمند کے ساتھ متحدہ عرب امارات میں مقیم ہیں اور یہاں کے مومنین کو اپنے فیوض وبرکات سے مالا مال کررہے ہیں۔آپ سے کسی نے فرمائش کی کہ فرصت کے لمحات میں سے کچھ وقت نکال کر آپ اپنی یادداشتوں کو کتابی شکل میں مرتب فرمادیں، کیونکہ آپ 50 سال سے زیادہ عرصہ سے اس میدان میں گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

محترم اشرف عباس صاحب کے والد ماجد، گرامی عالیجناب منور عباس ایڈووکیٹ صاحب مرحوم بھی ہماری قومی زندگی کے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے، جن کے گھر پر مجالس ومحافل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔اور محترم اشرف عباس صاحب کو اپنے منفرد لہجے، مخلصانہ انداز اور انتہائی کم عمری ہی سے ہر قسم کے کلام کی منفرد انداز سے ادائیگی کی جو خداداد صلاحیت حاصل ہے اسکے نتیجے میں بلا مبالغہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں محافل میں شرکت اور انکی نظامت کا موقع بھی ملا ہے۔جس کے نتیجے میں گذشتہ ۵۵ سال کے دوران مشہور شعراء اور گرامی مرتب شخصیات کے ساتھ آپ کو غیر معمولی قربت ملی، جن میں عالیجناب سید آل رضا صاحب، جناب شبیر حسن جوش ملیح آبادی، تقدس مآب مولانا محمد مصطفیٰ جوہر صاحب، جناب زیبا ردولوی، جناب شاہد نقوی، جناب سید سبطِ حسن انجم، جناب پروفیسر سردار نقوی، جناب عروج بجنوری، جناب معجز جونپوری، جناب سید آل محمد رزمی، جناب سید سبطِ جعفر شہید، جناب پروفیسر تقی ہادی صاحب شہید، جناب آباد محمد زائر نقوی صاحب، جناب ساحر فیض آبادی جیسے مرحومین اور خصوصیت سے علامہ رشید ترابی سے جو آپ نے کسب فیض، رہنمائی، پذیرائی، حوصلہ افزائی، تربیت اور قربت حاصل رہی اس کا ذکر آپ نے تفصیل سے زیر نظر کتاب میں

تحریر کیا ہے۔ اسکے علاوہ علامہ طالب جوہری صاحب، جناب ساحر لکھنوی صاحب، اور عہد حاضر کے دیگر نامور شعرائے کرام کے ساتھ مجالس ومحافل میں شرکت کے علاوہ اُن سے قریبی تعلقات بھی حاصل رہے۔ محترم اشرف عباس صاحب نے ۵۵ سال پر مشتمل اپنی گرانقدر یاداشتوں کو سپردقلم فرمایا اور اب یہ کتاب آپکے سامنے ہے جس کا نام ہے :

"قصہ نصف صدی کا"

خود اپنے موضوع کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے گزشتہ نصف صدی کے دوران، بارگاہ اہلبیت طاہرین علیہم السلام میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے والی گرانقدر شخصیات کا ذکر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ :

یہ کتاب اُن تمام لوگوں کیلئے ایک گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو بزرگان ملت کے حالات سے واقفیت کا شرف رکھنا چاہتے ہوں۔

میری دعا ہے کہ پاک پروردگار بتصدق چہاردہ معصومین علیہم السلام، ہمارے واجب الاحترام جناب اشرف عباس صاحب دام مجدہ کو صحت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے، اور آپکے فیوض و برکات سے اہل ایمان بہتر فیضیاب ہوتے رہیں۔

maablib.org

تہذیبیہ سرگزشت

نصیر ترابی

قصہ نصف صدی کا...... فی الاصل ایک تہذیب پناہی سرگزشت اور ایک تربیت گاہی سفرنامہ ہے۔

یہ تحریر اس آدمی کی ہے جو طبعاً و فعلاً مدرّس ہے لہٰذا ایک عمر کی تدریسی شاہ خرچی کے بعد زبان و بیان از خود سلاست آشنا ہو چکے ہیں اور لفظ کا برمحل صرف ایک کشش کا جواز ہو چکا ہے۔

کسی بھی سرگزشت کو لکھنے کے لیے بالحاظ عبارت، آدمی کا درون آدمی کم از کم حساس اور متوازن ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اشرف عباس کی شخصیت میں یہ دونوں جوہری عناصر یعنی حساس اور متوازن ہونے کی گنجائش ان کی نسبی تربیت اور نفسانی بصیرت کی آب و تاب کے ساتھ بدرجہ اتم کارفرما ہے۔

اس تحریر میں اشرف عباس وہ متوازن آدمی ہیں جو قانون ضرورت کی سہولت کے باوجود کسی بھی موصوف کے حق میں بے جا صفت کے استعمال سے چنداں روگرداں نظر آتے ہیں۔ ''قصہ نصف صدی کا اس قافلے کی روداد پر مشتمل ہے جس کا شجرہ حسن نظر اور حسن کلام کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اس قافلے میں شریک ہر مسافر کو اپنی مسافتی خلش کے اظہار پر توفیقاً ایک کرشماتی رسائی حاصل ہے۔

آدمی نے تفہیم کے لیے زمانے کو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس تقسیم کو وہ ماضی، حال اور مستقبل کہتا ہے۔ ہر زمانہ اپنے ہونے کی گواہی گزرے ہوئے واقعات کی زبانی دیتا ہے۔ اس حوالے سے زمانہ گزر جانے کے باوصف گزرتا نہیں بلکہ دل و دماغ کی گزرگاہوں سے وقتاً فوقتاً گزرتا رہتا ہے۔ یہ عدم کا وجود میں آنے اور جانے کا ایک خواب ناک سلسلہ ہے۔

اشرف عباس کی اس دلگیر سرگزشت میں ماضی اپنی ہمہ جہتی کے زعم میں جم کر سرگوشی کر رہا ہے۔ یہ ماضی ہرچند کہ اب یادش بخیر ہو چکا ہے، لیکن اس کی تجوری میں حال کو خوشحال رکھنے کی طلسماتی اکسیر اور مستقبل کو اعتبار مہیا کرنے کی کیمیا موجود ہے۔ یہ وہ ذخیرہ ہے جو معاشرت اور معاملت کے لئے ایک خزانہ خیر ہے، اعتبارات اور تعینات کا سرگزشت عموماً آئینہ دکھاتی ہے اور سرگزشتی احوال کے لکھنے والے کی آنکھ کا زاویہ آئینے سے وقت کی جمی ہوئی گرد کو صاف کرنے پر مامور و مجبور ہوتا ہے۔ سرگزشت میں چہرے نہیں کردار بولتے ہیں۔ بکھرا ہوا سامان نہیں آثار بولتے ہیں۔ اشرف عباس کی یہ دلآویز سرگزشت اپنی ذاتی نمود و نمائش کی خاطر کاغذ پر نہیں آئی ہے بلکہ اشرف عباس نے ایک عہد کی غائبانہ ملاقات سے نوواردوں کی سمت نمائی کا قرض چکا دیا ہے۔ یہ اشرف عباس کی وہ دلربائی ہے جس میں محسوسات کی شفافیت کے بین السطور ایک خاموش اور ہم کلام اشارہ بھی قاری کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

اشرف عباس کی اس تہذیبیہ سرگزشت میں جانے والوں کی نشست و برخواست کے غمزہ دراز مرحلوں کی آڑ میں آنے والوں کے لئے ایک جمالیاتی بسیرا آباد کیا ہے۔

اشرف عباس نے جہاں اپنی خوش آوازی کو ایک سخاوتی رویہ کر رکھا ہے وہاں ہم جیسوں کے نزدیک نصف صدی کے اس قصے کو بھی اشرف عباس کے محسنات میں شمار ہونا چاہیے۔

نصیر ترابی
اپریل کا چوتھا دن، ۲۰۱۷ء
شہرِ بے مہر...... کراچی

حسینی فکر کی آواز

افتخار عارف

قرآن مجید میں ارشادِ رب العزت ہے "کہ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا" پھر یوں بھی ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے خود کچھ نفوسِ قدسیہ کے ذکر کو بلند کیا اور جن منتخب بندوں کے ذکر کو رفعت دی گئی اور ان میں ایک ذاتِ گرامی سید الشہداء امام ابا عبداللہ حسین ابن علیؑ کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ سن ۶۱ ہجری میں ہونے والے کربلا کے واقعے نے ذہنِ انسان پر دوامی نقوش ثبت کیے ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں میں فرہنگِ کربلا مشترک بھی ہے اور ایک دوسرے سے قدرے جدا جدا بھی۔ پاکستان کی تہذیبِ عزاداری اپنا ایک بالکل مختلف اسلوب رکھتی ہے۔ تہذیبِ غم مجلس عزا، منبر، خطیب، علم، نوحہ خوانی، سوز خوانی، سلام، مرثیہ اور فرشِ عزا سے عبارت ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب برصغیر کے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آباد ہوئے تو ذکرِ حسینؑ کو ایک بالکل نئے رخ سے دیکھنے کی سعادت میسر آئی۔

کراچی میں مجالس سے خطاب کرنے والوں میں حضرت علامہ رشید ترابیؒ، نے خطابت کا وہ چراغ روشن کیا جس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس کے علاوہ علامہ سید محمد دھلویؒ، علامہ سید محمد رضیؒ، علامہ محمد مصطفیٰ جوہرؒ، علامہ ابن حسن جارچویؒ اور مرثیہ کہنے والوں میں حضرت سید آل رضا، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت نسیم امروہوی، استاد قمر جلالوی، ڈاکٹر یاور عباس، حضرت زیبا ردولوی نمایاں پیش پیش تھے۔ نشتر پارک، خالقدینا ہال بڑا امام باڑہ کھارادر، مارٹن روڈ اور عزا خانہ ایرانیاں میں جس معیار اور جس اخلاص و عقیدت کے ساتھ مجلسیں ہوتیں وہ ایک مثالیے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے منتظمین میں مرحوم و مغفور جناب حسن عسکری (والد ہادی عسکری)، چچا منور عباس، آغا ریحانی اور دیگر افراد مجالس کے اہتمام کی ذمہ داریاں برداشت کرتے تھے۔ منور عباس صاحب کے صاحبزادے عزیز مکرم جناب اشرف عباس نے انہی مجلسوں سے اپنی سلام خوانی کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں وہ حضرت علامہ ترابی سے بیشتر ممتاز شعرا کا منتخب کلام اپنی پرسوز آواز میں پیش کرتے جس کے بعد علامہ زیبِ منبر ہوتے تھے۔ نوجوانی کے زمانے ہی میں خوش لحن ترنم مومنین کے ہر طبقے میں مقبول تھا اور آج بھی ہے، اشرف عباس خود بھی شعر کہتے ہیں مگر اساتذہ کے کلام ہی کو پیش فرمایا۔ میں نے پچاس برس تہذیبِ عزا کا یہ سفر دیکھا ہے۔

بڑی جزا ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے ذکرِ حسینؑ کو بلند رکھا ہے۔ مظلوم کی آواز اور فکرِ حسینی کو عام کرنے والی آوازوں میں اور سلام خوانی کے ذیل میں برادر اشرف عباس صاحب یکتا نظر آتے ہیں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ انکا ثانی اب تک اس عزائی تربیت کیساتھ منظرِ عام پر نہ آسکا آپکی منبر پر نشست، تن پوشی لباس وغیرہ انکی صفات میں نظر آتی ہیں۔

آواز کی روشن قندیل

ڈاکٹر ہلال نقوی

۶۷-۱۹۶۶ء کا وہ دور ذہن میں عود کر رہا ہے۔ جب میں راجہ صاحب محمود آباد کے قائم کردہ سراج الدولہ کالج واقع بالمقابل کریم آباد (فیڈرل بی ایریا) میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا، کالج سے کچھ فرلانگ کے فاصلے پر حضرت جوش ملیح آبادی کا دولت کدہ تھا کالج کے شعبۂ اردو کے صدر ہمارے استاد پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب اکثر و بیشتر جوش صاحب کی خدمت میں جایا کرتے تھے پہلی مرتبہ انہی کے ہمراہ جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ میری زندگی کا مسرت آمیز اور حیرت ناک ادبی موڑ تھا کہ صدی کے سب سے بڑے شاعر کے پاس بیٹھنے اور ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔

جوش صاحب کے حلقے میں بیٹھنے والوں میں راغب مراد آبادی، زیبا ردولوی گجراتی زبان کے شاعر صابر تھاریانی اور جناب منور عباس ایڈووکیٹ و دیگر احباب شامل تھے۔ منور عباس صاحب ادبی و مذہبی حلقوں کی معروف شخصیت اور شہر کی مرکزی مجالس عزا، منعقدہ نشتر پارک کی انتظامی کمیٹی کے اہم رُکن اور بعد میں صدر بھی رہے۔ اُن سے میری ملاقات انہی نشستوں میں ہوئی۔

نشتر پارک کی مجالس میں علامہ رشید ترابی کا بصیرت افروز و دانش آموز طرز خطابت ہم نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا میں بھی وہاں حاضر ہوتا تھا اور منور عباس صاحب سے ہاتھ ملانے کی حد تک ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ ہم اس وقت طالب علم تھے، جوش صاحب بھی گاہے گاہے ان مجالس میں شرکت فرماتے۔ انہی دنوں مجھے علم ہوا کہ علامہ رشید ترابی کے خطاب سے قبل ایک صاحب پیش خوانی کے طور پر کلام پیش کرتے ہیں اُن کا نام اشرف عباس ہے اور وہ منور عباس صاحب کے فرزند ہیں۔

اب اس زنجیر کی کڑیاں کچھ یوں تھیں۔ جوش ملیح آبادی، علامہ رشید ترابی، منور عباس، اشرف عباس اور نشتر پارک۔۔۔ اشرف عباس اس وقت جوان تھے ان کا دائرۂ احباب الگ تھا۔

وہ جوش صاحب سے منور عباس تک مختلف شعراء کا کلام و سلام پیش کرتے تھے ہم سب ان کی آواز سے متاثر تھے۔ علاوہ ازیں علامہ رشید ترابی کا منفرد طرزِ خطابت اور علوم و مسائل عصرِ حاضر پر ان کی گہری نظر اور افکارِ تازہ کا نچوڑ مجالس میں بیان کرنا بھی ہمارے لیے کشش رکھتا تھا۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اشرف عباس سے بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ ان کا تعلق درس و تدریس کے شعبے سے تھا بعد میں، میں بھی اسی شعبے سے وابستہ ہوگیا۔ لہٰذا نیازمندی اور محبت کا رشتہ گہرا ہوتا چلا گیا۔

جب فیڈرل بی ایریا میں بلاک ۲۰ آباد ہوا تو اس میں علامہ رشید ترابی کے دولت کدے کے بالکل عقب میں منور عباس صاحب کا مکان تھا، میرے منجھلے بھائی سید افضال رضا بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ لہٰذا میں بھی اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ عزاداری کے حوالے سے بھی یہ محلہ مرکزی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ شہر کی اکثر بڑی مجالس میں اشرف عباس صاحب سلام پڑھتے تھے ہم سب ان کی آواز کے شیدا تھے حقیقت امر یہ ہے کہ اس طرزِ سلام خوانی کے بانی بھی وہی ہیں۔

اسی دوران انجمن آرزو کی ماہانہ نشستیں بھی منور صاحب کے مکان پر منعقد ہونے لگیں۔ میں بھی حاضر ہوتا تھا، جس کی ایک اہم وجہ وہاں جوش صاحب کی موجودگی ہوتی، جس میں میرے لیے کشش کا سامان موجود تھا۔

تاریخ کا ورق اُلٹا۔ ۳۰، ۴۰ سال گزر گئے، دنیا بدل گئی، منور صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کا مکان بھی فروخت ہوگیا۔ میں اپنی تمام تر توجہات اپنی شاعری، رثائی ادب اور جوش شناسی کی ادارت، مرثیے سے متعلق تحقیق اور جوش صاحب کی تخلیقات کی جمع آوری اور، ترتیب و اشاعت میں منہمک ہوگیا۔ اسی سلسلے میں اشرف عباس صاحب سے رجوع کیا اور درخواست کی، گو کہ اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ ان سے کہہ چکا تھا کہ وہ اپنی یادداشتیں مرتب کریں ــــ اس لیے کہ ان کا مکان اور مکین ادب و مذہب کے حوالے سے ایک ادارے اور انجمن کی حیثیت رکھتے تھے، خاص طور سے جوش صاحب کے حوالے سے کچھ باتیں محفوظ ہوجائیں ورنہ محض گفتگو تو طاقِ نسیاں ہوجائے گی۔

بہر حال جناب اشرف عباس پہلے تو گوناگوں مصروفیات کی بناء پر وقت نہ نکال سکے اور تاخیر ہوتی رہی لیکن اب کچھ باتیں جو ان کے حافظے میں باقی رہ گئی ہیں اس میں سے کچھ انہوں نے قلم بند کر دی ہیں، بہت کچھ تحریر ہونے سے رہ گیا ہے۔ لیکن ان کا عزم یہی ہے کہ وہ ضرور کوشش کریں گے کہ اگر ان کی صحت نے اجازت دی تو وہ اس کتاب کا دوسرا حصہ ضرور ترتیب دیں گے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی
۱۱ اگست ۲۰۱۷ء کراچی

maablib.org

عندلیبِ گلستانِ عزا

ظفر عابدی

مرثیہ گوئی کوئی نئی صنف سخن نہیں بلکہ اس کا سراغ ایام جاہلیت میں بھی ملتا ہے۔ لیکن تاریخ کے سب سے بڑے سانحے واقعہ کربلا کے بعد مرثیہ کربلا ہی سے مخصوص و مختص ہو کر رہ گیا۔

برصغیر میں دکنی حکومت نے میں ادب کی اس صنف کو مزید وسعت ملی، عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ جیسے حکمرانوں نے مرثیے کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا، جب یہ صنف لکھنو آئی تو معراج کمال حاصل ہوا۔ میر انیس اور مرزا دبیر جیسے مرثیہ گویوں نے جو عروج حاصل کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مرثیے کی پڑھت نے بھی اسے مقبول عام بنانے میں موثر کردار ادا کیا۔ پاکستان کے حوالے سے ایسے کئی نام نظر آتے ہیں جنہوں نے ادب کی اس شاخ کے حوالے سے اہم خدمات انجام دیں ان ناموں میں سے ایک نام ایسا ہے جو دور حاضر میں مقبولیت کی بلندیوں پر ہے۔ اور جنہیں ہم اشرف عباس کے نام سے جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سلام و مرثیہ کو ایک نئی راہ دی ہے۔ ''تقدم ولدی'' ہو یا ''چودہ صدیاں بیت گئیں'' یا کوئی سلام انہوں نے لحن داؤدی سے اسے دوام بخش دیا۔ ایسے اساتذہ شاید ہی ہوں جن کا کلام ان کی زبان پر آ کر ایک نئے انداز میں نہ ڈھل گیا ہو۔

نصف صدی سے زیادہ عرصے تک محیط نشتر پارک کے مرکزی عشرہ محرم میں علاوہ ازیں خالق دینا ہال اور مختلف عزاخانوں میں مسلسل سلام پیش کرتے رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں لیکن اپنے کلام کے بجائے اساتذہ کے کلام کو ترجیح دیتے ہیں۔

علامہ رضی جعفر صاحب نے انہیں عندلیب گلستانِ فصاحت کا خطاب دیا۔ پروردگار ان کو طول عمر صحت کے ساتھ عطا کرے اور وہ ثنائے محمد و آل محمدؐ کرتے رہیں اور عوام میں بھی مقبولیت حاصل رہے۔

(ظفر عابدی)

اظہارِ تشکر

مشرف عباس

میں بچپن ہی سے اپنے گھر پر مجالس مشاعرے اور مثالے منعقد ہوتے دیکھتا آرہا ہوں، جس کو ابتداء میں میرے دادا منور عباس صاحب مرحوم منعقد کرتے تھے اور ان کے بعد والد محترم اشرف عباس صاحب منعقد کرتے آرہے ہیں، ان محافل اور مجالس میں صفِ اوّل کے شعراء اور ذاکرین کی شرکت والد صاحب کے بے لوث جذبے اور خدمتِ اہل بیتؑ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مجالس کا اہتمام چاہے غریب خانے پر ہو یا کسی مقام پر، والد صاحب ہمیشہ وقت کی پابندی، معیاری کلام کے انتخاب، کسر نفسی اور خلوصِ نیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں، میرے نزدیک ان کی یہی خاصیت، ان کی شخصیت کو ممتاز بناتی ہے۔ دادا مرحوم کی طرح، میرے والد کا حافظہ بھی حیران کن ہے، ان کی یادداشت بھی غضب کی ہے، حال ہی میں قبلہ علامہ طالب جوہری صاحبؒ نے نشتر پارک کے منبر سے خطاب کے دوران فرمایا تھا:

"اشرف عباس صاحب کی یادداشت تو ایسی ہے کہ ان کو برسوں پرانی باتیں ازبر ہیں"

والد صاحب ہمیشہ ہی سے کم گو رہے ہیں لیکن ان کے پاس یادداشتوں کا وہ انمول ذخیرہ ہے کہ کافی عرصے سے علم وادب سے تعلق رکھنے والے ادیب، شاعر، دانشور، قدردان، احباب و دوستان سے مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ وہ انہیں لکھ کر کتابی شکل دے دیں، پیش نظر کتاب، 'قصہ نصف صدی کا'، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، علامہ طالب جوہری صاحب نے حکم دیا ہے، اور میری بھی یہی خواہش ہے کہ والد صاحب انشاءاللہ اس سلسلے کو آگے بڑھائیں اور مزید یادداشتیں قلم بند کر کے شائع کریں، صحت کے ذیل میں انہیں جو کئی مشکلات پیش آتی ہیں وہ بڑی استقامت اور محبت سے ان کا مقابلہ کرتے رہے ہیں، ان کی اسی حوصلہ مندی سے یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے، انشاءاللہ

مشرف عباس

۳ ر ستمبر ۲۰۱۷ء

مضامین

انجمن آرزو

میرے چند واقعات و حالات

ابتدائے سلام خوانی

شعر و شاعری سے رغبت

سلام خوانی کے ذیل میں چند واقعات

والد کی وفات

نصیحت

maablib.org

انجمن آرزو

میرے قبلہ گاہی جناب منور عباس پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کے بعد انھوں نے یو پی کے ایک چھوٹے سے شہر لکھیم پور کھیری سے وکالت کا آغاز کیا۔ شادی میرٹھ میں قریبی رشتہ داروں میں ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی وکالت کا چرچہ ہو گیا اور وہ صفِ اوّل کے وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ لیکن بقول اُن کے وہ آنے والے حالات اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں اکثر فکر مند رہتے تھے۔ اس لئے کہ وہ ماشاءاللہ تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے باپ بن چکے تھے۔ بچوں کی بہتر تعلیم اور خوشحال مستقبل کی طرف سے وہ قطعی ناامید تھے۔ اسی لئے وہ لکھیم پور میں اپنی جمی جمائی وکالت، بہترین حویلی کا مکان، دوست احباب اور سب سے بڑھ کر عیش و آرام کی زندگی ترک کر کے میرٹھ منتقل ہو گئے اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد (قیام پاکستان کو دو سال ہو چکے تھے) آپ نے اہلیہ اور بچوں سمیت پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بیشتر عزیز و اقارب نے انھیں روکنا چاہا، لیکن والد صاحب مرحوم میں ایک خاص عادت تھی کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کر لیتے تو اس پر اٹل ہو جاتے اور پھر وہ کام ہر صورت کر کے رہتے۔ چنانچہ رختِ سفر بندھ گیا اور آخر کار ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ عیسوی کو پہلی مرتبہ ہم نے وطن عزیز کی سرزمین پر قدم رکھا۔

میرے ماموں جناب احمد علی پہلے ہی یہاں آ چکے تھے اور انھوں نے ہماری آمد سے قبل ہی رہائش کا بندوبست کر لیا تھا چنانچہ بندر روڈ پر مشہور محلہ مولوی مسافر خانہ کی گنگا رام بلڈنگ کی پہلی منزل پر (موجودہ صابری ہوٹل کے اوپر) فلیٹ میں ہم لوگ رہائش پذیر ہوئے۔ ماموں کی ہی کوششوں سے کراچی سٹی کورٹ کے بالمقابل مشہور کورٹ چیمبرز کی تیسری منزل پر والد صاحب کو دفتر بھی مل گیا۔ اور یہاں وکالت کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

اسی عمارت کی پہلی منزل پر عظیم مرثیہ گو شاعر جناب سیّد آل رضا مرحوم، دوسری منزل پر جناب عزم جونپوری مرحوم کے دفاتر بھی تھے۔ ایک تو ہم پیشہ اور اس سے بڑھ کر والد صاحب کا ابتداء سے شاعرانہ مزاج، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ان حضرات کے درمیان بے تکلفانہ تعلقات استوار ہو گئے اور آہستہ آہستہ مصروفیات سے ہٹ کر شعرو شاعری اور ادب کی مختصر نشستیں وہیں دفتر میں ہونے لگیں۔

مذکورہ بالا دونوں معزز شخصیات کی وساطت سے رفتہ رفتہ مزید شعراء بھی تشریف لانے لگے، اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ ان ادبی نشستوں میں ارم لکھنوی، حشم لکھنوی، رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی، ذوالفقار علی بخاری، مرزا حامد لکھنوی، کرار جونپوری، مظفر جونپوری، معجز جونپوری، بابا ذہین شاہ تاجی، شاہد نقوی، عابد حشری، اُستاد قمر جلالوی، دلاور فگار، سماء لکھنوی، صہبا اختر جیسی نامور شخصیات بھی آنا شروع ہو گئیں۔

انہی دنوں میں اردو ادب کی مایہ ناز شخصیت اور صفِ اوّل کے بہترین شاعر جناب آرزو لکھنوی کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ یوں تو تمام شعرائے اردو میں ان کی بے حد قدر و منزلت تھی لیکن جناب آل رضا مرحوم انھیں اپنا استاد مانتے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، چنانچہ عین اس وقت جب تدفین کا عمل جاری تھا اور مذکورہ بالا تمام شعراء موجود تھے، وہیں قبرستان میں آل رضا صاحب کی تجویز پر ایک انجمن تشکیل دی گئی۔ جس کا نام "انجمن آرزو" رکھا گیا اور تمام حاضرین نے اتفاق رائے سے آل رضا صاحب ہی کو صدر اور ظفر جونپوری صاحب کو انجمن کا سکریٹری چن لیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس انجمن کی پہلی نشست میرے والد کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی تمام شعراء نے شرکت فرمائی اور یہ نشست تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی غالباً اس کی دو وجوہات رہی ہوں ایک تو یہ کہ اس میں (اُس وقت کے) شہر کے پائے کے شعراء شریک تھے، دوسری یہ کہ اُن دنوں کراچی میں اتنی معیاری، صاف

ستھری اور منتخب شعراء سے مزین محفلِ شعروسخن شاید کہیں نہیں ہوتی تھی۔ یہ اعلان کیا گیا کہ اب ہر ماہ کے آخری اتوار کو سہ پہر چار بجے یہ نشست ہوا کرے گی۔ یہ طرحی محفل ہوگی اور آرزو صاحب کا ہی کوئی مصرعہ طرح کیلئے دیا جائے گا، یہ بھی طے ہوا کہ ہر ماہ باری باری ایک ایک رکن کے گھر پر یہ اجتماع ہوں گے۔ کچھ عرصے اسی طرح سلسلہ جاری رہا پھر میرے والد نے تجویز پیش کی کہ چونکہ میرے غریب خانے میں ایک بڑا ہال ہے اور اس میں کافی گنجائش بھی ہے لہٰذا یہ نشست ہر ماہ وہاں ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور پھر اختتام سلسلہ تک یہ نشست وہیں ہوتی رہی اور اپنی نوعیت اور کامیابی کے لحاظ سے تھوڑے ہی عرصے میں ''انجمن آرزو کی ماہانہ طرحی نشست'' شہر بھر میں مشہور ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس میں شعراء کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ والد محترم کا انتقال ۱۹۸۸ عیسوی میں ہوا۔ اس کے بعد میں نے تقریباً چار برس تک اس سلسلہ کو بالکل اسی طرح جاری رکھا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ناپسندیدہ عناصر کی نامعقول مداخلت اور قابلِ اعتراض حرکات کی وجہ سے اسے منقطع کرنے پر مجبور ہو گیا۔

والد مرحوم ان نشستوں کا خصوصی طور پر اہتمام کرتے تھے، چائے اور دیگر لوازمات سے حاضرین کی تواضع کی جاتی اور اس کے بعد محفل کا آغاز ہوتا تھا۔ نسبتاً کم معروف یا نوآزمو شعراء اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اتنے بڑے بڑے شاعروں کے سامنے انھیں اپنا کلام سنانے کا موقع ملتا تھا اور اس محفل کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس بات سے قطع نظر کہ شاعر بڑا ہے یا چھوٹا، اچھے کلام کو دل کھول کر داد دی جاتی تھی اور نئے شعراء کے لئے یہ بات نہایت حوصلہ افزا تھی۔ ایک بات جو میں کبھی نہیں بھول سکتا، والد مرحوم ہر ماہ مصرعہ طرح پر غزل کہتے (یہ غزلیں ان کی ڈائری میں ان کی اپنی تحریر میں اب بھی محفوظ ہیں) لیکن ماہانہ نشست میں کبھی نہیں پڑھتے تھے ایک مرتبہ مرحوم معجز جونپوری نے کہا وکیل صاحب ایک غزل ہر ماہ کہتے ہیں محفل میں پڑھتے کیوں نہیں؟ فرمایا لوگ کہیں گے کہ اپنا کلام سنانے کیلئے اپنے گھر پر یہ سارا انتظام کرتے ہیں۔ میں ان کی اس بات سے بے حد متاثر ہوا۔

ابتدائے نعت وسلام خوانی

اسکول کی زندگی ہی سے نعت خوانی کا شوق تھا، محافل میں لوگ تبرکاً پڑھوا دیتے تھے۔ اسی طرح ماہ محرم میں خود بخود سلام پڑھنے کی طرف توجہ ہو جاتی تھی۔

۱۹۶۳ء میں پہلی مرتبہ عوامی مرکز خالق دینا ہال (جس میں ذاکر علامہ رشید ترابی مرحوم تھے) میں سلام پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور بحمد اللہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یادش بخیر خالقدینا ہال کی مجالس میں سوز خوانی نہیں ہوتی تھی، ہال کے سامنے کی مسجد سے اذان عشاء کا انتظار ہوتا تھا اور اذان کے فوراً بعد حضرت علامہ رشید ترابی زیب منبر ہوتے تھے، ۱۹۶۳ عیسوی کے محرم کی غالباً دوسری تاریخ تھی مجمع پر سناٹا طاری تھا ابھی اذان نہیں ہوئی تھی، مجھے نہ جانے کیا سوجھی، میں نے اپنے والد سے آہستگی سے کہا کہ میں ایک سلام پڑھ دوں، میں کبھی کبھار گھروں کی مجالس میں ترنم سے پڑھ لیتا تھا لیکن کبھی کسی بڑی مجلس میں پڑھنے کا نہ موقعہ ملا تھا اور نہ ہمت ہوئی تھی۔ چنانچہ میری یہ بات سن کر والد نے سختی سے جھڑک دیا۔

علامہ صاحب ان کے برابر ہی میں تشریف فرما تھے وہ یہ گفتگو سن تو نہ سکے لیکن انھوں نے میرے والد سے پوچھا صاحبزادے کیا کہہ رہے ہیں؟ انھوں نے بات کو ٹالنا چاہا لیکن علامہ صاحب کے اصرار پر پوری بات بتادی۔ علامہ صاحب نے فرمایا اس میں حرج کیا ہے پڑھنے دیجئے چنانچہ اذان ختم ہوتے ہی انھوں نے فرمایا چلو بیٹا منبر پر جاؤ، میں زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے مجمع کے سامنے منبر پر سلام پڑھنے کے لئے بیٹھا تھا ،ظاہر ہے میری حالت جو ہو رہی ہوگی، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حالتِ پریشانی سے ٹانگیں شدت سے کپکپا رہی تھی، میں پسینے میں تر تھا لیکن آنکھیں بند کرکے ہمت کی اور اپنی زندگی کا پہلا سلام پڑھا۔ والد محترم کے سلام کے کچھ اشعار زبانی یاد تھے:

کبھی فرطِ ادب میں اشک افشانی نہیں جاتی
ہیں لب خاموش لیکن مرثیہ خوانی نہیں جاتی

میں سلام ختم کر کے منبر سے نیچے اترا، مجمع کی طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند تھیں، لیکن علامہ صاحب نے میری انتہائی حوصلہ افزائی فرمائی اور میرے والد سے فرمایا وکیل صاحب آپ نئے سلام کہہ کر انھیں دیجئے اور کل سے یہ روزانہ نشتر پارک کی مجالس میں سوز خوانی کے بعد سلام پڑھیں گے۔ اس طرح میری سلام خوانی کا آغاز ہوگیا۔ والد محترم صبح آٹھ بجے دفتر کیلئے روانہ ہوتے تھے انھوں نے خود کبھی گاڑی نہیں چلائی ہمیشہ ڈرائیور رہتا تھا لہٰذا انھیں موقع مل جاتا اور راستہ طے کرتے ہوئے ایک سلام کہہ لیتے تھے اور میں شام کی مجلس میں مایہ ناز سوز خواں جناب عظیم الحسن کی سوز خوانی کے بعد سلام پڑھ دیتا تھا۔ مجھے مومنین کی جانب سے یقیناً بے پناہ پذیرائی ملنے لگی تھی لیکن حضرت علامہ رشید ترابی کی جانب سے ملنے والی حوصلہ افزائی نے مجھے کہیں سے کہیں پہنچادیا، علامہ صاحب نے مجھے اتنا آگے بڑھایا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، یہاں میں بڑے فخر سے ایک بات کہہ سکتا ہوں اور مجھے

> ہمیشہ اس پر ناز رہے گا کہ اس وقت تک کہیں بھی مجلس میں ذاکر سے پہلے لحن سے سلام پڑھنے کی روایت نہیں تھی، علامہ صاحب نے اس کی داغ بیل ڈالی اور سہرا میرے سر رکھا گیا، گویا مجلسوں میں سلام پڑھنے کی ابتدا مجھ سے ہوئی۔

ابتدا میں علامہ ترابی اور میرے والد نے اس سلسلے میں میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی بھی کی اور رہنمائی بھی، کسی مجلس میں سلام پڑھنا ہوتا تو اکثر انتخاب بھی والد کرتے اور میں پہلے ان کو پڑھ کر سناتا تھا۔ علامہ صاحب بھی جب نیا سلام کہتے تو مجھے بلا کر عنایت فرماتے تھے۔

میں نے مکرر عرض کیا ہے کہ علامہ ترابی مرحوم کی جانب سے بے پناہ حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ علامہ رشید ترابی کی رحلت کے بعد ان کے فرزند علامہ عقیل ترابی صاحب نے نشتر پارک کا منبر سنبھالا، اُس سال محرم کے آغاز ہی سے بارشوں کا سلسلہ جاری تھا لیکن شب عاشور ہونے والی طوفانی بارش نے قیامت برپا کر دی شہر میں تو جو کیفیت تھی اس کا کیا ذکر لیکن نشتر پارک میں یہ کیفیت تھی کہ شامیانے گر چکے تھے، تمام دریاں بھیگ گئی تھیں۔ بیٹھنا تو در کنار پانی میں کھڑے ہونا مشکل تھا، تاروں میں کرنٹ تھا ساؤنڈ سسٹم کا بھی حشر خراب تھا، اور صبح ساڑھے سات بجے مجلس کا وقت مقرر تھا۔ عقیل ترابی صاحب کسی نہ کسی طرح پہنچ گیے، سوز خوان نہیں پہنچ سکے تھے، الیکٹریشن نے بھاگ دوڑ کی اور کمال مہارت سے مائیک چلا دیا ایک دم مجھے اشارا دیا گیا کہ سلام پڑھ کر مجلس کا آغاز کروں، حالات کے پیش نظر میں دل قطعی اس طرف رجوع نہیں تھا کہ اچانک ذہن میں نجم آفندی مرحوم کا سلام آیا۔

''اس چاند کی دس کو سانجھ تلک شبیرؑ سے دنیا خالی تھی''

یہ سلام میں نے پہلی مرتبہ پڑھا تھا، ایک تو حالات پہلے ہی پریشان کن تھے پھر نجم صاحب کے اس سلام کے ایک ایک شعر نے وہ قیامت ڈھائی اور مجمع میں ایسا شدید گریہ ہوا کہ آج تک لوگ یاد کرتے ہیں۔

یہ (56) برس جن میں نشتر پارک کی مجالس سے وابستہ رہا ہوں میرے سامنے مختلف ذاکرین ان میں خطاب فرماتے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ تمام علماء اور ذاکرین نے ہمیشہ میری بہت زیادہ عزت افزائی فرمائی۔

جب میں نے علامہ صاحب کے حکم پر جب نشتر پارک میں سلام پڑھنا شروع کیا تو کوئی اندازہ اور تصور نہ تھا کہ کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اللہ تبارک تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ آج ۳۸ ہجری کے محرم میں مجھے وہاں سلام پڑھتے ہوئے ۵۶ سال ہو گئے اور

اس دوران ایک دن کی بھی غیر حاضری نہیں ہوئی۔ اول عشرے کی چہلم کی اور ایک ۲۷ صفر کی شب میں شہادت امام حسنؑ کی، یہ بارہ مجالس ہر سال کے پروگرام میں شامل ہیں اس دوران بڑے پائے کے ذاکرین اس منبر سے خطاب فرماتے رہے۔ جن میں علامہ رشید ترابی کے بعد علامہ عقیل ترابی، علامہ طالب جوہری، علامہ رضی جعفر، علامہ حسن ظفر، علامہ عرفان حیدر عابدی، علامہ عباس کمیلی، مولانا طاہر علی خان، حافظ تصدق حسین، ڈاکٹر سلمان ترابی، مولانا تقی شاہ، مولانا شہنشاہ نقوی کے اسم ہائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

مجھے ان تمام کی پیش خوانی کا شرف حاصل ہے۔ میں ہمیشہ بارگاہ رب العزت میں دست بہ دعا رہتا ہوں کہ جب تک سانس کی آمد وشد جاری ہے یہ نعمت خداوندی مجھے حاصل رہے اور موت آئے تو برسرِ منبر سلام پڑھتے ہوئے، کہ اس سے بڑھ کر سعادت، شرف اور خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ یہاں میں سچے دل سے اس بات کا اعتراف کروں گا کہ سلام خوانی کے سلسلہ میں ہر خطیب و ہر ذاکر اور علامہ حضرات نے میری ہمیشہ ہر آن ہر لحظہ بھرپور حوصلہ افزائی کی، یہاں تک کہ ہندوستان سے تشریف لانے والے ذاکرین علامہ نقن صاحب اعلی اللہ مقامہ، علامہ ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ مولانا غلام عسکری صاحب قبلہ مرحوم اور موجودہ دور کے علامہ عقیل الغروی، ڈاکٹر کلب صادق اور مولانا احسان حیدر جوادی و دیگر شامل ہیں۔ فیڈرل بی ایریا میں ایک صاحب کے گھر پر مجلس میں سلام کے ایک شعر پر نقن صاحب قبلہ نے بیساختہ دو مرتبہ سبحان اللہ فرما کر شعر مکرر پڑھنے کا حکم دیا۔

شعروشاعری سے رغبت ودلچسپی

والدگرامی کوشعروشاعری سے گہرا شوق اوراپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے ہٹ کرصرف یہی ایک شوق تھا۔اوراس شوق کی تکمیل کے لئے اپنے چند احباب کے ساتھ مل کر''انجمن آرزو'' کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی جس کے تحت ہرماہ کے آخری اتوارکوگھرپرطرحی نشست ہواکرتی۔ سُوئے ادب کے سبب میں ان نشستوں میں بیٹھنے سے گریز کرتا تھالیکن چونکہ شوق تھاچنانچہ کھڑکی کے باہر بیٹھ کرنہ صرف شعراء کا کلام سنتا بلکہ پوری پوری غزلیں لکھتا بھی رہتا(آج سے چالیس پچاس برس پہلے لکھی گئی ان میں سے چندغزلیں آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں)۔

اس طرح یہ شوق بڑھتارہایہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تھوڑی بہت صلاحیت شعرگوئی کی بھی پیداہوگئی لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ کبھی غزل کہنے کا خیال دل میں نہیں آیا، صرف سلام اورمنقبت کی طرف توجہ رہی۔ جب بھی کبھی کچھ اشعارہوجاتے تومرحوم سبطِ حسن انجم اورکلیم آلِ عباشاہدنقوی مرحوم کودکھاکران سے اصلاح لیتارہاان دوحضرات کے علاوہ جناب مولاناسیّد حسن امداداس سلسلہ میں مجھ پرخصوصی عنایات فرماتے رہے(مولانا مستقلاً امریکہ میں قیام پذیرہوگئے اوردارفانی سے عالم بقا کی جانب کوچ کرگئے)۔

میرے چند حالات و واقعات

میں نے ۱۹۵۸ء میں کراچی کے ایک گورنمنٹ اسکول سے میٹرک اور ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے گریجویشن کرلیا۔ ۱۹۶۳ء میں ایس ایم لاء کالج میں ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ ایک سال کا کورس ختم ہوا امتحان میں پاس تو ہوا لیکن نمبر بہت کم تھے بہت دلبرداشتہ ہوا، اور ایسا دل اچاٹ ہوا کہ پھر دوسرے سال میں داخلہ لینے کے بجائے ایل ایل بی کا ارادہ ترک کردیا۔ ایک سال کا عرصہ یونہی گزر گیا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، آخر ایک دوست کے مشورے پر ذہن بنالیا کہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی اختیار کی جائے۔ والد نے شدت سے مخالفت کی ان کا کہنا تھا کہ اس میدان میں مستقبل تابناک نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ترقی کی تو ہیڈ ماسٹر بن جاؤ گے اور بس، بات ان کی بالکل صحیح تھی لیکن میں نہ مانا آخر انھوں نے اجازت دے دی، اُن دنوں ہماری رہائش ناظم آباد نمبر ۲ میں تھی اور تھوڑے ہی فاصلے پر بی ایڈ کالج تھا، مرحوم قیصر حسن بختیاری وہاں کے پرنسپل اور میرے والد کے دوست تھے انھوں نے داخلہ تو دیدیا لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ میں ٹیچر نہ بنوں تو اچھا ہے، بہرکیف ایک سال کا کورس تھا اور یہ عرصہ بہ آسانی گذر گیا۔ امتحان ہوگیا تھا میرے ساتھ ایک صاحب قمر الحسن نقوی بھی بی ایڈ کررہے تھے اور وہ حسینی بوائز اسکول ناظم آباد میں پہلے سے ٹیچر تھے۔ نتیجہ آنے میں ابھی دیر تھی وہ مجھے اپنے ساتھ اسکول لے گئے، اس اسکول کی بنا علامہ سید محمد رضی مجتہد نے رکھی تھی۔ مرزا علی اظہر صاحب ایڈووکیٹ اس کی انتظامیہ کے سربراہ تھے اور میرے والد کے رفیق اور ہم پیشہ بھی تھے، اس لیئے میری تقرری آسانی کے ساتھ ہوگئی۔ میں نے بی ایڈ کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل ہوئی، کچھ عرصے کے بعد سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری کا اشتہار شائع ہوا میں بھی درخواست گزاروں میں شامل تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کمشنر کراچی سید دربار علی شاہ (اور شاید آخری مرتبہ) نے امیدواروں سے انٹرویو لئے۔ الحمداللہ چندروز میں میرا تقرر گورنمنٹ بوائز اسکول جیکب لائن میں ہوگیا۔

سلام خوانی کے ذیل میں کچھ اہم واقعات

مجالس میں مختلف علماء اور ذاکرین خطاب کرتے ، کافی تعداد میں شہر بھر میں ہوتی تھیں اور ان میں ترتیب اس طرح ہوتی کہ سوز خوانی کے بعد ذاکر زیب منبر ہو جاتے ، اکثر مجالس میں کوئی انجمن نوحہ خوانی کرتی۔ ایک وقت وہ تھا کہ شہر کی مختلف امام بارگاہوں میں بڑی مجالس ہوتی تھیں اور صفِ اوّل کے لائق، مستند اور جید ذاکرین اپنی خالص علمی، فکری اور قابل تحسین گفتگو سے سامعین کو مستفید فرماتے تھے۔ مرکزی مجلس صدر میں جہانگیر پارک میں ہوتی تھی جہاں مولانا سیّد ابن حسن جارچوی صاحب خطاب فرماتے تھے ، ان کے علاوہ ذاکرین جن کا شمار صفِ اوّل میں کیا جاتا ان میں مولانا محمد مصطفےٰ جوہر، علامہ رشید ترابی ، مولانا محمد اسماعیل دیوبندی ، مولانا اظہر حسن زیدی ، حافظ کفایت حسین ، مولانا محمد بشیر فاتح ٹیکسلا شامل ہیں۔

اسی طرح شہر کے نامور اور معروف سوز خوانوں میں عظیم الحسن ، اُستاد معشوق علی خاں ، آغا مقصود مرزا ، آفتاب علی کاظمی ، اختر وصی علی اور چند دیگر کے نام مجھے یاد ہیں۔

لیکن یہاں میں ایک بات کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ بڑی بڑی ذاکری کی عوامی مجالس میں بعد از سوز خوانی اساتذہ کے سلام لحن سے پڑھنے کا آغاز مجھ سے ہوا اور اس بات پر مجھے انتہائی فخر ہے۔ میں نے سب سے پہلا سلام اپنے والد منور عباس شہاب صاحب کا خالقدینا ہال کی مجلس میں پڑھا جس کے بعد ترابی صاحب مرحوم کے حکم سے اگلے دن سے نشتر پارک میں روزانہ پڑھنے لگا ، اور اب میرے لئے نہایت سعادت ، شرف اور پروردگار کا کرم اور در پنجتن سے خصوصی عنایت اور مہربانی کا باعث ہے کہ 1963 سے آج 2018 تک میں بخیر خوبی اس خدمت کو انجام دے رہا ہوں اور اس دوران ایک دن کی بھی غیر حاضری نہیں ہوئی۔ 1984 عیسوی محرم کی نویں تاریخ کی سہ پہر میری والدہ کا اور ان کے نصف گھنٹہ بعد میری اپنی بیٹی کا انتقال ہو گیا ، اور شب عاشور دونوں کی تدفین ہوئی دسویں محرم کی مجلس نشتر پارک میں صبح ساڑھے سات بجے ہوتی ہے ، اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی میں سلام پڑھنے کے لئے گیا۔

ان کے علاوہ ہندوستان سے آنے والے محترم ومکرم ذاکرین کے سامنے بھی سلام پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

ایک موقع پر علامہ عقیل الغروی صاحب نے فرمایا ۔

"یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اللہ نے آپ کو جو خوبصورت آواز عطا کی ہے آپ نے اس کا صحیح استعمال بھی کیا ہے اور اسے صرف اسی ایک مقصد کیلئے استعمال کرتے ہیں"۔

یہ باتیں خدانخواستہ کسی بڑے بول کی عکاسی نہیں بلکہ صرف اس لئے یہاں ضبط تحریر کر رہا ہوں کہ میں انھیں اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں، ورنہ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں میرا سلام پڑھنا بار خاطر محسوس ہوتا ہے۔ایک ذاکر اہلبیت (نام لینا مناسب نہیں) اپنی تقریر سے پیشتر میری پیش خوانی کی اجازت نہیں دیتے ایک موقعہ پر باب العلم میں مجلس پڑھنے کے لیے تشریف لائے، مجھے وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ وہ مجلس پڑھیں گے، میرے دل میں کچھ بھی نہیں تھا میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن موصوف نے میرے سامنے منتظمین سے فرمایا کہ ایسا کریں انہی سے پڑھوا لیجئے ہم نہیں پڑھیں گے ہم جا رہے ہیں۔ میں نے منتظمین کو بہ وقت اس بات پر راضی کیا کہ وہ سلام کے بغیر ہی موصوف کو منبر دے دیں، اور میں ان کی خوشی کی خاطر بغیر پڑھے واپس آ گیا ۔

میرے والد ہر سال گھر پر تحت اللفظ مرثیے کی ایک مجلس کا اہتمام کرتے تھے انھیں "میر عشق کا مشہور زمانہ" زعفر جن" کا مرثیہ بے حد پسند تھا اور وہی مرثیہ ہر سال پڑھا جاتا تھا۔

جناب سیّد آل رضا کو خاص طور پر اس مرثیے کے پڑھنے میں کمال حاصل تھا اور وہ جب تک زندہ رہے ہمارے غریب خانے پر یہ مرثیہ پڑھتے رہے، ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا لیکن مجالس ہوتی رہیں اور وہ میں نے اپنی حسب استطاعت تادمِ تحریر جاری رکھی ہوئی ہیں۔ آل رضا مرحوم کے بعد مدعو شدہ شاعر اپنا تصنیف کردہ مرثیہ پیش کرنے لگے چنانچہ ابتداء میں چند برسوں تک پروفیسر سردار نقوی مرحوم، پھر ڈاکٹر ہلال نقوی (جو جدید مرثیہ گو شعراء میں میرے والد کے پسندیدہ ترین شاعر ہیں) امید فاضلی مرحوم، جناب سیّد سبط حسن انجم مرحوم، جناب احسن ذوالقدر جونپوری، جناب شاہد نقوی اور

ایک سال ہندوستان سے آئے ہوئے معروف شاعر پیام اعظمی بھی مرثیہ پیش فرما چکے ہیں، یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جوش صاحب کا نام ان میں سرفہرست ہے۔

میں گزشتہ صفحات میں انجمن آرزو کا تذکرہ تفصیل سے کر چکا ہوں اس کے تحت ہونے والے ماہانہ مشاعروں کی ایک خاصیت یہ تھی کہ ہمیشہ طرحی ہوتے تھے نشست ختم ہونے سے قبل آئندہ ماہ کے لیے مصرعہ کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ ایک بات اس سلسلے میں قابل ذکر ہے وہ یہ کو جوش صاحب جو غزل کے ہمیشہ سے خلاف تھے اور مصرعہ طرح سے تو انھیں بیر تھا، ان مشاعروں میں پابندی سے شرکت فرماتے اور یہاں کے صاف ستھرے اور خوشگوار ادبی ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے یہاں کے مصرعہ ہائے طرح پر چند غزلیں بھی پیش فرمائیں۔

مشاعروں کا یہ سلسلہ پابندی سے جاری رہا اور شہر بھر میں خاصی شہرت ہو گئی تھی، ایام عزاء کے دوران غزل کے مشاعروں کی جگہ مسالمے ہوتے اور وہ بھی حسب معمول مصرعہ طرح کے تحت ہی ہوتے تھے۔

میرے والد کے ایک دوست ان مشاعروں میں شرکت کے لیے آتے تھے کچھ تھوڑی بہت شاعری بھی کرتے تھے لیکن سخن فہم حضرات اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ موصوف کا کلام نہایت غیر معیاری بلکہ اغلاط سے پُر ہوتا تھا لیکن ان مشاعروں میں برسرعام کسی کی حوصلہ شکنی یا بے عزتی نہیں کی جاتی تھی، اگر کسی شاعر کو داد نہ ملے تو وہ خود سمجھ لیتا تھا کہ میری غزل کیسی تھی، یہ موصوف کافی عرصے تک مُصر رہے کہ میں ان کا کم از کم ایک سلام نشتر پارک میں پڑھوں لیکن میں ٹالتا رہا۔ اُس محرم میں بوتراب امام بارگاہ میں ہونے والی مجالس سے بھی علامہ طالب جوہری صاحب خطاب فرمارہے تھے اور میں روزانہ سلام پڑھتا تھا۔ آخرکار بہت پُرزور اصرار پر میں نے ایک دن ان کا سلام پڑھ دیا جبکہ والد گرامی منبر کے عین مقابل تشریف فرما تھے، مجلس ختم ہوئی ہم لوگ گھر آ گئے رات گیارہ بجے ان کے کمرے میں پیشی ہوئی۔

پہلا سوال یہ تھا کہ یہ کس کا سلام آپ نے پڑھا؟
پھر پوچھا کیا یہ آپ کو بہت زیادہ پسند تھا؟
کہ آپ نے اس کا انتخاب کیا؟

میں نے تمام صورتحال مختصراً بیان کی، اس پر انھوں نے فرمایا کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ لوگ آپ کو زیادہ کیوں پسند کرتے ہیں؟ اچھے ترنم اور اچھی آواز کو اس معاملے میں فوقیت نہیں ہے۔ اچھے ترنم اور آواز والے اور بھی شہر میں ہیں اور ہوسکتا ہے کچھ آپ سے بھی بہتر ہوں۔ اصل سبب یہ ہے کہ آپ اساتذہ کا کلام پڑھتے ہیں جو ادب کے شہنشاہ رہے، اُن کے کلام اعلیٰ معیاری اور خالص ادبی ہوتے ہیں۔ جب آپ غلط اور غیر معیاری اشعار پڑھنا شروع کر دیں گے تو لوگ آپ کو سننا چھوڑ دیں گے۔ تو اس سے بہتر ہے کہ آپ پڑھنا چھوڑ دیں اور کہیں فلم وغیرہ میں گانا گانے کے لیے کوشش کریں وہاں یہ سب چل جاتا ہے۔

بس وہ دن اور آج کا دن، سلام کا انتخاب کرنے سے پہلے تین چار مرتبہ غور کرتا ہوں، یہی سبب ہے کہ ٹوٹی پھوٹی شاعری خود بھی کرلیتا ہوں لیکن کبھی کسی مجلس میں اپنا کلام آج تک نہیں پڑھا، کچھ اس لئے بھی کہ ہمیشہ سے دوسروں کا کلام پڑھتا آیا ہوں اگر کبھی اپنا پڑھنے کی جسارت کروں تو لوگ یہی کہیں گے پتہ نہیں کس کا سلام ہے مقطع میں انھوں نے اپنا نام ٹھونس دیا ہے۔

نعت وسلام اور منقبت وغیرہ پڑھنے کے سلسلے میں رہنمائی اور ہدایت تو میں اکثر سینئر شعراء سے لیتا رہا جن میں سب سے پہلے شاہد نقوی صاحب، ان کے علاوہ حسن امداد، سبطِ حسن انجم، ڈاکٹر ہلال نقوی صاحبان نے ہمیشہ میری رہنمائی کی لیکن ایک بات میں بلا جھجھک کہہ سکتا ہوں کہ یہ درِ اہلبیت کا صدقہ ہے اور مجھ پر شہزادی کونین بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کا خصوصی کرم ہے کہ کسی کلام کو پڑھنے کے لئے دھن بنانے یا اسے اپنے ترنم میں لانے کے

لیے میں نے نہ کسی سے تربیت لی اور نہ ریاض حاصل کیا۔ سوائے اس کے کہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ سے توفیقات اور مدد کی دعا کرتا ہوں اور اس کی دو مثالیں میں بجا طور پر پیش کرسکتا ہوں۔

شب چہلم (19 صفر) میرے گھر پر نذر تھی میرے والد حیات تھے اور ہم پانچوں بھائی اُن کے ہمراہ مہمانداری میں مشغول تھے، شاہد نقوی صاحب تشریف لائے اور دستر خوان پر بیٹھتے ہی انھوں نے مجھے ایک کاغذ دے کر کہا کہ لو بھائی یہ ایک نیا سلام ہوا ہے اسے دیکھ لینا، کسی قابل ہو تو کہیں پڑھ دینا، میں نے اسی وقت اسے دیکھا اور اگلی صبح نشتر پارک کی مجلس میں پڑھ دیا۔

دوسرا واقعہ تقریباً دس برس قبل ہوا۔

نشتر پارک میں محرم کی پانچویں مجلس تھی، علی اوسط زیدی مرحوم کی سوز خوانی ختم ہونے والی تھی علامہ طالب جوہری صاحب نے مجھ سے فرمایا سامنے مجمع میں راغب مراد آبادی بیٹھے ہیں انھیں یہاں تخت پر بلا لیجیے گا۔ سوز خوانی ختم ہوتے ہی انھیں بلا لیا گیا، کچھ اعلانات ہو رہے تھے علامہ صاحب نے راغب صاحب سے فرمایا کوئی سلام پڑھنے کے لیے، انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت تو یاد نہیں میں ایک قطعہ لکھ کر دیتا ہوں وہ اشرف عباس پڑھ دیں گے، میں منبر پر جا چکا تھا حکم ہوا کہ ذرا توقف کیجیے، پھر ایک چھوٹے سے پرچے پر قطعہ لکھا ہوا مجھے دے دیا گیا اور میں نے فوراً اسے ترنم سے پڑھا اسی دوران میں ایک اور قطعہ آ گیا جو مختلف بحر میں تھا چنانچہ اس کی طرز تبدیل ہونا تھی، اللہ کا شکر ہے کہ پنجتن پاک نے میری مدد کی اور مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔

maablib.org

جامعہ کراچی کے چند طلباء وطالبات نے یوم حسینؑ آرگنائزنگ کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی یہ بات تقریباً 1971 عیسوی یا اسی کے لگ بھگ کی ہے۔ مرحوم حسن عسکری، مرحوم ریاض عسکری، ثمر عباس جعفری، صمصام حسنین، عاشق علی ہیمانی، ملکہ جعفری وغیرہ، یہ شخصیات تنظیم کی روحِ رواں تھیں، اس تنظیم کے الگ الگ یونٹ ہر کالج اور جامعہ میں قائم کیے گئے تھے اور اس تنظیم کا سب سے بڑا کام ہر ادارے میں یوم حسینؑ کا انعقاد کرانا تھا یہ جلسے بڑی دھوم دھام سے اور بہترین نوعیت اور معیار کے ہوتے تھے اور ہر مکتبہ فکر کے علماء، دانشور، مفکر، مقرران میں مدعو کیے جاتے تھے، ہر جلسہ تین چار گھنٹے جاری رہتا اور طلباء وطالبات بڑے ذوق وشوق سے ان میں شرکت کرتے تھے۔ سب سے بڑا جلسہ یوم حسینؑ جامعہ کراچی میں منعقد ہوتا تھا جس میں جامعہ کی انتظامیہ کا پورا پورا تعاون شامل ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں ان جلسوں کا ایک لازمی جزو بن گیا تھا اس لیے کہ ہر جلسہ کا اختتام جناب سیّد آل رضا کے سلام آخر پر ہوتا تھا اور وہ مجھ سے پڑھوایا جاتا تھا۔ اس طرح شہر کے کسی تعلیمی ادارے میں جلسہ ہوتا' میری اس میں شرکت یقینی تھی۔ آہستہ آہستہ ان پروگراموں میں وسعت آتی گئی اور کراچی کے علاوہ اس کے یونٹ حیدرآباد، نواب شاہ، خیرپور، سکھر میں بھی قائم ہوگئے اور اس سلسلہ میں مجھے بھی ان مقامات پر جا کر پڑھنے کا موقعہ ملا، اسی سلسلے میں ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

ناظم آباد میں سرسیّد گرلز کالج میں یوم حسینؑ کے جلسہ میں مدعو کیا گیا، علامہ سیّد محمد رضی مجتہد، مولانا جاوید جعفری، مولانا اکبر درس، مولانا اصغر درس، فرانسس ایکس لوبو، جناب سیّد ناصر جہاں اور میں سب اسٹیج پر تھے، سب کے کنارے پر میں اور میرے برابر میں ناصر جہاں بیٹھے ہوئے تھے، ایک طالبہ نے اسٹیج کے قریب آ کر ایک پرچہ مجھے دیا اور پر ہی لکھا تھا

جناب ناصر جہاں صاحب پلیز آپ اپنی مشہور نظم تقدم دلدی سنا دیجئے۔ میں نے ناصر جہاں صاحب کا نام پڑھ کر آگے نہیں پڑھا اور پرچہ ان کی طرف بڑھا دیا، انھوں نے اسے پڑھا اور مسکراتے ہوئے واپس مجھے دیا اور فرمایا "جی نہیں یہ آپ ہی کے لیے ہے" اب میں نے پورا پرچہ پڑھا اور ان کی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھا تو محظوظ ہوا۔

ہماری قوم کے ایک صفِ اوّل کے خطیب وذاکر میری بہت زیادہ قدر افزائی فرمایا کرتے تھے (اللہ ان کو غریق رحمت کرے) ذاکری کے ساتھ ساتھ قومیات میں بھی پیش پیش رہتے اور فلاحی کاموں کی جانب بھی ان کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ مشہور زمانہ سیاسی وادبی شخصیت اور بھٹو صاحب کی کابینہ کے وزیر جناب کوثر نیازی سے ان کے گہرے مراسم تھے وہ حج بیت اللہ سے واپس آئے تو علامہ صاحب نے اپنے دولت کدے پر ان کی کھانے کی دعوت کی۔ مہمانوں میں، میں بھی شامل تھا تقریب کے دوران ایک نظم مجھے دی گئی جو مہمان خصوصی کی شان میں تھی اور صرف انہی کی تعریفوں سے پُر تھی، مجھ سے کہا گیا میں اسے ترنم سے پڑھوں۔ میں نے معذرت کی کہ میں محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا کسی کی مدح میں کہے گئے اشعار نہیں پڑھ سکتا، مجھ پر بہت زور دیا گیا لیکن میں پڑھنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ نظم تو خیر ایک نوجوان صاحبِ بیاض سے پڑھوائی گئی لیکن علامہ صاحب مجھ سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہوگئے۔

انعام نقوی صاحب سے بہت اچھے مراسم ہو گئے تھے مرحوم شاعر بھی تھے اور انتہائی نفیس، ملنسار، خوش مزاج اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ بھائی اشرف عباس ہمارے ایک عزیز شمالی ناظم آباد میں رہتے ہیں کسی سرکاری محکمہ میں اچھی پوسٹ پر ہیں اپنے گھر پر جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا کی ولادت کا میلاد منعقد کرتے ہیں

اوراُن کی بہت خواہش ہے کہ تم ان کے یہاں پڑھو، میں نے وعدہ کر لیا وہ مدعو شدہ شاعروں کے ہمراہ مجھے بھی لے کر ظہیر حسن زیدی صاحب کے گھر پہنچے بہت شاندار انتظامات تھے میلاد ہوا اور اس کے بعد نہایت پر تکلف دستر خوان کا اہتمام تھا۔ ظہیر صاحب وہی تھے جن کے ایک بیٹے کی شادی علامہ عرفان حیدر عابدی مرحوم کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ چلتے وقت ظہیر حسن زیدی صاحب نے بڑی قسمیں دے کر مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ہر سال 26 جمادی الثانی کو محفل میلاد میں اور 26 صفر کو سالانہ مجلس عزا میں ان کے یہاں شرکت کروں گا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات میں انتہائی وسعت آتی گئی۔ ظہیر صاحب انتہائی شریف، نیک، با اخلاق اور ہر ایک کے ہمدرد مشفق و مہربان شخص تھے۔ اس محفل میلاد کی نظامت انعام نقوی صاحب کیا کرتے تھے، پھر ایک سال اچانک مجھے حکم دیا کہ اب یہ ذمہ داری تم سنبھالو، میں مجبور ہو گیا اور پھر دوسرا سال آنے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا، نظامت میں کرتا رہا، اس دوران ظہیر صاحب کا انتقال ہو گیا، ان کے دونوں فرزندان ظہیر عباس اور قمر عباس نے اس سلسلہ کو جاری و ساری رکھا ہوا ہے لیکن اب میں محفل و مجلس دونوں میں مجھے مدعو نہیں کیا جاتا۔

اس طرح کا ایک اور واقعہ جس سے مجھے تکلیف پہنچی تھی اور اب بھی اکثر یاد کرتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے۔ خواجہ کمیل مرحوم، علامہ طالب جوہری صاحب کے سیکرٹری جو سندھ مدرسہ کی مسجد میں ہونے والے بم دھماکے میں شہید ہوئے تھے۔ ان سے اور ان کے گھرانے سے بالکل برادرانہ تعلقات تھے۔ ان کے بڑے بھائی خواجہ محمد اشرف، چھوٹے بھائی خواجہ جاوید، ہم لوگوں میں بھائیوں جیسی محبتیں تھیں۔ کمیل صاحب مرحوم کے بچے اکمل، اجمل اور محمد علی اور ان کی بیٹی یہ سب مجھے باپ ہی کے برابر چاہتے تھے، 11 ذیقعدہ کو ہر سال جشن امام

رضا علیہ السلام بڑی دھوم دھام سے ان کے گھر پر ہوتا تھا۔ اس میلاد کے لیے شعراء سے رابطے، ان کو دعوت نامے پہنچانا ان کی محفل میں باعزت طور پر نگہداشت کرنا، غرض کھانے وغیرہ کے کام کے علاوہ دیگر تمام کاموں میں کمیل صاحب کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی محفل میلاد نہایت مختصر منعقد ہوئی جس میں جناب عروج بجنوری، جناب معجز جونپوری اور میں نے منقبتیں پڑھیں اور مولانا طیب آغا الجزائری نے تقریر فرمائی اور یہ تقریب گھر کے ڈرائنگ روم میں کی گئی۔

رفتہ رفتہ محفل کی شہرت بڑھتی رہی سامعین کے ذوق وشوق میں اضافہ ہوتا گیا اور اسی مناسبت سے اس کی رونق اور شان وشوکت خوب سے خوب تر ہوتی رہی۔ اس محفل کی تین چار خاصیتیں تھیں جو بہت سے مومنین کو یاد ہوں گی، ایک یہ کہ وقت کی پابندی کے ساتھ ٹھیک آٹھ بجے شب میں شروع ہوتی اور ٹھیک ساڑھے دس بجے ختم کردی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کی نظامت ہمیشہ کوثر نقوی صاحب کیا کرتے (اب نہیں معلوم کون کرتا ہے) تیسرے یہ کہ شعراء کے علاوہ جید علماء بھی اس میں شرکت فرماتے تھے، اور چوتھے یہ کہ میں بہرصورت ان میں موجود ہوتا، انتقال سے ایک سال قبل خواجہ کمیل شہید یہ اعلان کرکے کہ اشرف عباس صاحب وہ واحد شخصیت ہیں انھیں اس جشن میں لگاتار اور بلاناغہ شرکت کرتے ہوئے پورے پچیس سال ہوگئے لہٰذا میری اور اہل خانہ کی جانب سے ایک تحفہ پیش خدمت ہے یہ امام رضا کے روضہ مبارک کی ایک نہایت خوبصورت شبیہ تھی، اسی کے ساتھ انھوں نے اعلان کیا کہ اگر میں اس دنیا میں نہ بھی رہوں تو میری جگہ اشرف عباس صاحب اس جشن کا انتظام سنبھالیں گے۔ لیکن جانے کیوں ایسا ہو نہ سکا۔

والدِ گرامی کی وفات

میرے والد جناب منور عباس کا شمار کراچی کے صفِ اوّل کے وکلاء میں ہوتا تھا، وکالت کرتے ہوئے ۵۰ برس مکمل ہوئے تو سندھ ہائی کورٹ کی جانب سے ایک خصوصی تقریب میں انہیں خراجِ تحسین اور اُسکے ساتھ ایک اعزازی شیلڈ پیش کی گئی تھی اُنہوں نے تمام عمر کبھی فوجداری مقدمہ کی پیروی نہیں کی اُنکا کہنا تھا کہ اس میں دروغ گوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وکالت کے دوران دو مرتبہ اُنہیں جج بننے کی پیشکش ہوئی اُنہوں نے معذرت کی۔

۱۹۸۸ء میں والد محترم کا انتقال عجیب کیفیت میں ہوا، تین دن سے طبیعت خراب تھی اور شدید کمزوری لاحق تھی، ہم بھائیوں نے طے کیا کہ آپکو ہسپتال لے جایا جائے، آپ تیار نہ تھے، اور بڑی مشکل سے راضی کیا گیا، میڈی کیئر ہسپتال میں ڈاکٹر مجید کے پاس بیٹھے کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر ڈاکٹر نے کہا کہ آپ لیٹ جائیں، آپ خود اپنے قدموں پر چل کر گئے چند منٹ بعد ڈاکٹر نے ہمیں بتلایا کہ اب بہت بہتر ہیں، مگر چند لمحوں بعد ہی آپ دارِ فانی سے دارِ آخرت صفر کر گئے۔ میں اُنکی قوت خدداری نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔

نصیحت

والد نے میرے اوپر ایک بہت سخت پابندی عائد کر دی تھی جب مجھے شہرت ملی تو آپ نے فرمایا کہ میں کبھی بھی کوئی ہدیہ قبول نہ کروں، کوئی کتنا ہی اصرار کرے آپ صاف انکار کر دیں اور میں نے سن لیا کہ آپ نے پڑھنے کے پیسے لئے ہیں تو آپ کے پڑھنے پر پابندی عائد کر دوں گا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میں اُنکی ہدایت پر آج تک عمل پیراں ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ اس بُرائی سے محفوظ رکھے۔ میں یہ بھی پسند نہیں کرتا اور نہ زحمت دیتا ہوں کہ مجھے سواری فراہم کی جائے، میں وقت مقررہ سے قبل ہی پہنچ جاتا ہوں ، اس عادت کے باعث بعض اوقات سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔

جب مجلس وقتِ مقررہ پر شروع نہیں ہوتی اور طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔

میری قربتیں

خطیب عالم اسلام حضرت علامہ رشید ترابی
شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی
حجتہ الاسلام مولانا محمد مصطفےٰ جوہر (طاب ثرہ)
علامہ طالب جوہری
مولانا حسن امداد
علامہ رضی جعفر نقوی
صادقینِ عظیم
مولانا پروفیسر تقی ہادی (شہید)
مولانا محمد علی نقوی
مولانا شہنشاہ حسین نقوی
ڈاکٹر سلمان ترابی

maablib.org

خطیبِ عالم اسلام حضرت علامہ رشید ترابی

خطیبِ عالم اسلام حضرت علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہٗ سے میرے والد کے بہت گہرے مراسم اور روابط استوار ہو گئے تھے، لہٰذا والد مرحوم ان کی ہر مجلس میں شریک ہوتے تھے، یہاں تک کہ علامہ صاحب خود انہیں اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔ محرم کے عشرہ اولیٰ کی مجالس جو پاک محرم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جہانگیر پارک میں ہوا کرتی تھیں علامہ صاحب کی کوششوں سے نشتر پارک میں مجالس 1963 میں منتقل ہوئیں اور والد مرحوم پاک محرم کے رکن منتخب ہوئے۔ علامہ صاحب روزانہ چار مجالس (نشتر پارک، خالق دینا ہال، بڑا امام بارگاہ کھارادار اور حسینیہ ایرانیاں) سے خطاب فرماتے اور میں اپنے والد کے ہمراہ چاروں مجالس میں پابندی سے شرکت کرتا تھا۔ ان مراکز میں خالقدینا ہال کی مجالس کے سلسلے میں جناب حسن عسکری مرحوم کا نام اہم اور بنیادی ہے۔ یہ بات بھی واضح کردوں کہ علامہ رشید ترابی نے تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں پہلا عشرہ اربعین جناب حسن عسکری صاحب کی دعوت پر خالق دینا ہال میں ہی پڑھا تھا۔

حضرت علامہ رشید ترابی کی خطابت اور ان کی مجالس کی ایک بہت بڑی تاریخ ہے جسے ہمارے دور کے مورخین کو قلم بند کرلینا چاہئے۔ نشتر پارک کی مجالس میں میرے والد کچھ مواقع پر جوش صاحب کو بھی لے کر آئے، منبر کے پیچھے جہاں قنات کی دوسری طرف صوفے رکھے ہوتے تھے وہاں بیٹھ کر جوش صاحب علامہ کی مجلس سنتے چونکہ وہ گھٹنوں میں تکلیف کے سبب فرش پر بیٹھنے سے قاصر تھے۔ جوش صاحب کے علاوہ اُس دور کی نامور گراں قدر شخصیات شریک ہوتی تھیں۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میں نے ہمیشہ اساتذہ اور بڑے شعراء کے کلام کو پڑھنے کے لئے منتخب کیا۔ علامہ رشید ترابی کے کلام سے اس سلسلے کا آغاز ہوا اور ابھی تک یہ معیار اور یہ اصول قائم ہے میں ہر سال نشتر پارک کی پہلی مجلس میں علامہ صاحب کا سلام پڑھتا ہوں۔ علامہ صاحب جب تک ہمارے درمیان تھے وہ اپنا ہر نیا سلام مجھے مرحمت

نشتر پارک میں مجالس ۱۵ [illegible] ۱۹۶۳ء سے شروع

فرماتے تھے اور میں اسے مختلف مجالس میں پڑھتا تھا۔ جب بھی نیا سلام کہتے مجھے حاضری کا حکم ہوتا اور میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حاصل کر لیتا اور جہاں ان کا حکم ہوتا پڑھتا، پھر کچھ عرصے بعد یہ سعادت حاصل ہونے لگی کہ جب کہیں وہ مجلس سے خطاب کرتے، مجھے ایک روز قبل پیغام مل جاتا کہ فلاں مقام پر سلام پڑھنا ہے۔ چنانچہ علامہ صاحب نے جتنے سلام کہے وہ آج غالباً صرف میرے پاس محفوظ ہیں اور میں اپنا فریضہ سمجھ کر ہر سال نشتر پارک کے عشرے کی ابتداء انہیں کے سلام سے کرتا ہوں۔

میری سلام خوانی حضرت علامہ کے زیرِ سرپرستی پروان چڑھتی رہی، اسی دوران علامہ صاحب کی کرم نوازیاں مجھ پر رہیں ان کا کوئی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ چند واقعات جو ہمیشہ میرے ذہن میں محفوظ رہیں گے ان کا مختصراً تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۶۹ء میں ہم اور علامہ صاحب ہمسائے بن چکے تھے، علامہ صاحب کے مکان کے عقب میں ہمارا مسکن تھا، ابھی تک اس علاقے میں کوئی تیسرا مکان آباد نہیں ہوا تھا چنانچہ یہ معمول بن گیا تھا کہ میرے والد روزانہ شام کے وقت دفتر سے آنے کے بعد وہاں جاتے اور دیر تک علامہ صاحب کے دولت کدہ پر نشست رہتی، اُن دنوں میرے والد کے علاوہ دیگر حضرات بھی علامہ صاحب کے خاص عقیدت مندوں میں تھے، جن میں مولانا حسن امداد صاحب، مولانا علی حاکم صاحب، جناب حفیظ صاحب (فرنیچر والے)، ڈاکٹر احسن، مولانا مفتی زین الحسن صاحب، سوزخواں دیوان جی اور یہ ڑو بھائی بھی خدمت گذاری کیلئے موجود رہتے اور یہ نشستیں روزانہ کا معمول تھیں۔ میں ان دنوں سرکاری ملازمت میں آچکا تھا اور گورنمنٹ اسکول جیکب لائن میں معلم کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا، مولانا حسن امداد صاحب پہلے ہی سے وہاں عربی ٹیچر کی حیثیت سے موجود تھے، میرے وہاں آجانے سے انھیں بہت خوشی بھی ہوئی اور دلی تقویت بھی ملی۔

یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے، اتوار کا دن تھا، ابو میاں (حضرت علامہ رشید ترابی کے صاحبزادے ابوطالب مرحوم) نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ کو بابا بلا رہے ہیں۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی نیا سلام دینے کیلئے بلایا ہوگا، میں اسی وقت وہاں پہنچا، علامہ صاحب تشریف فرما تھے اور دوسری جانب آپ کے خاص خاندانی درزی بھی موجود تھے، علامہ صاحب کا حکم ہوا کہ اشرف کا ناپ لے لو، انھوں نے میرا ناپ لیا اور علامہ صاحب نے مجھے مخاطب کر کے

فرمایا "بابا" یہ آپ کی شیروانی سی کر لائیں گے اور اب
آپ آئندہ سلام پڑھتے وقت بغیر شیروانی کے منبر پر نہیں جاؤ گے۔ خدا حافظ،

حدِ ادب میں بول تو کچھ نہ سکا اور واپس ہو گیا لیکن شش و پنج میں تھا کہ ابھی تو کپڑا ابھی نہیں ہے اور پھر کپڑا لے بھی لیا جائے تو میں کیا کروں گا؟ گھر آ کر قصہ بیان کیا والد صاحب بھی قدرے متفکر ہوئے اور اسی وقت فون پر رابطہ کر کے بات کرنا چاہی، جواب ملا آپ پریشان نہ ہوں شیروانی کا کپڑا درزی کو پہنچا دیا گیا ہے اور پھر ٹھیک ایک ہفتے بعد ماسٹر صاحب میرے دروازے پر شیروانی لئے کھڑے تھے۔ اس طرح سب سے پہلی شیروانی جسے زیب تن کر کے میں منبر پر گیا وہ میرے لئے حضرت علامہ کا تحفہ تھا۔

اگر قارئین اسے بڑا بول یا غرور و تکبر نہ سمجھیں تو میں ایک بات کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں، علامہ صاحب جب بھی کہیں مجلس پڑھتے تو اس کا مکمل پروگرام خود مرتب کر کے منتظمین کو دیتے اور اس میں خود علامہ کی اجازت کے بغیر ذرہ برابر رد و بدل کی کوئی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہر ایک کو منبر پر بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے، اب کچھ یوں ہو گیا تھا کہ میرا سلام علامہ رشید ترابی کی مجلس کا تقریباً لازمی جزو سمجھا جانے لگا تھا اور میرا ایمان ہے کہ مجھے اس سعادت میں جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے خاص کرم اور قبولیت کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ کی انتہائی کرم گستری اور ذاتی پسند اور مجھ ناچیز کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کا عنصر نمایاں تھا، ثبوت کے طور پر درج ذیل واقعہ پیش کرسکتا ہوں۔

علامہ صاحب ہر سال ۲۵ محرم کو شہادت امام زین العابدینؑ کی مجلس پڑھتے اور مجھے یہ شرف حاصل تھا کہ میں سلام پڑھتا تھا، ایک دن قبل مجھے پیغام ملا کہ کل صبح پونے دس بجے نور باغ مسافر خانہ موسیٰ لین میں علامہ صاحب سے پہلے سلام پڑھنا ہے۔ اس زمانے میں میرے پاس کوئی ذاتی سواری نہیں تھی اور دور دراز کے سفر کے لئے بس استعمال کرتا تھا۔ میں نور باغ پہنچا، دروازے سے اندر داخل ہوا تو علامہ صاحب منبر پر تشریف لے جا رہے تھے ظاہر ہے مجھے پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی، علامہ صاحب کی مجلس میں وقت کی ایسی سختی سے پابندی ہوتی تھی کہ لوگ اپنی گھڑیاں ملاتے تھے چنانچہ وقت مقررہ پر علامہ صاحب منبر پر تشریف لے گئے۔ ان کی ایک خاص عادت تھی، منبر پر خطبہ کے آغاز سے

قبل وہ چاروں جانب نظریں دوڑاتے اور چند سیکنڈ تک مجمع کا بغور جائزہ لیتے تھے۔ ان کی اس عادت کا مجھے اچانک فائدہ ملا ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی، اور انھوں نے مجھے اشارہ سے منبر کے نزدیک بلایا، وہ منبر پر رونق افروز تھے، منبر سے اترنا تہذیب عزا کے خلاف ہے، تاہم مجھے حکم دیا کہ یہیں منبر کے ساتھ ہی کھڑے ہو کر چند شعر پڑھو۔ کیا یہ بات میرے لئے فخر و مباہات کا باعث نہیں ہے؟

علامہ صاحب کے لطف و کرم کا ایک اور واقعہ جو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ وہ جناح ہسپتال کے امراض قلب کے شعبہ میں داخل اور زیر علاج تھے، میرے والد ان کی مزاج پرسی کے لئے جا رہے تھے اور مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا اچھا ہوا بابا آپ آ گئے ہو، کل شب میں ایک نیا سلام ہو گیا ہے اسے آپ لے جاؤ۔ ابھی اس میں مصائب کے شعر نہیں ہیں جب میں گھر آؤں گا تو اس میں اضافہ کر دوں گا، اور وہ ان کی زندگی کا آخری سلام انہیں کی تحریر میں محفوظ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

کسی کے وقت کا تابع ہوں جب تک میں ہوں محفل میں
پُر از خاکِ شفا ہے شیشہ ساعت مرے دل میں

اسی سلام کے دو اور اشعار جو مجھے بہت پسند ہیں:

دُعاؤں نے تمہاری حیدرؑ کرار کو بھیجا
وہ جب آئے تو جانِ زار ٹھہری قلبِ بسمل میں
مسلسل نزع میں آواز آتی تھی نہ گھبرانا
علیؑ آتے ہیں مشکل میں علیؑ آتے ہیں مشکل میں

یہ تحریر کیوں کہ میں اپنے حوالے سے لکھ رہا ہوں اس لیے میں نے علامہ کی صرف ان کرم فرمائیوں کا تذکرہ کیا ہے جو مجھ پر تھیں، ورنہ یہ ایک بڑا موضوع ہے کہ علامہ کا فیضان کن کن شخصیات پر جاری رہا۔ اس ذیل میں جب کبھی کوئی اُن پر لکھے گا تو عام لوگوں، علماء کے علاوہ شعراء کے ذیل میں یاس یگانہ چنگیزی سے لے کر استاد قمر جلالوی تک ایک پوری داستان لکھی جائے گی۔

جب علامہ صاحب عارضۂ قلب کے سبب جناح ہسپتال کے امراضِ قلب وارڈ میں

داخل تھے اور ڈاکٹروں نے انھیں آرام کی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی۔ مومنین کو یاد ہوگا کہ اسی دوران 20 صفر آ گئی نشتر پارک میں چہلم کی مجلس کا اعلان ہو چکا تھا کہ علامہ صاحب ہسپتال میں داخل ہیں مجلس نہیں پڑھ سکیں گے، کسی اور ذاکر کا انتظام بھی ہو گیا تھا اچانک سب لوگ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ علامہ صاحب اچانک پنڈال میں داخل ہو رہے ہیں۔ منبر پر بیٹھ کر آپ نے بتایا کہ میں ذکر حسین نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لئے میں ڈاکٹروں سے چھپ کر نکل آیا آپ نے فرمایا

**"مجھے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہ سے شرم آئی کہ میں نے زندگی میں کبھی
بھی محرم کی ۹، ۱۰ اور چہلم کے موقع پر کبھی ناغہ نہیں کیا، یہ میری محرومی ہوگی
اسکے علاوہ جس چیز نے مجھے مجبور کیا وہ جو جنگی قیدی کے خطوط میرے نام تھے کہ
ہم آپ کی تقریر سننے کے منتظر ہیں میرا جو کچھ ہونا ہے وہ یہیں ہو جائے۔"**

(حوالہ: ترابی کی کہانی ترابی کی زبانی)

علامہ صاحب نے اپنے مخصوص لب و لہجے، انداز اور جوش و خروش سے خطابت فرمائی اور پوری تقریر کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ منبر پر بیٹھا ہوا شخص وہ ہے جو ابھی بستر علالت سے اٹھ کر آیا ہے، علامہ صاحب مجلس پڑھنے کے بعد واپس ہسپتال چلے گئے، بعد میں انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹروں نے مجھے وارڈ کے اندر ہلکی چہل قدمی کی اجازت دی تھی۔ اس روز میں چہل قدمی کرتا ہوا وارڈ سے باہر آ گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پارکنگ میں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا اور ڈرائیور سے کہا وارڈ میں سے میری شیروانی، ٹوپی اور چھڑی لے آؤ اور اس طرح نشتر پارک پہنچ گیا۔

علامہ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ بہت غصے والے ہیں۔ ہم نے کبھی ان کا غصہ تو نہیں دیکھا تھا لیکن ان کا رعب و دبدبہ یقیناً ایسا تھا کہ کسی کی ان کے سامنے بولنے تک کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایک موقعہ پر ہم نے جس کیفیت میں انھیں دیکھا اس سے یقین ہو گیا کہ واقعی بہت غصے والے ہیں۔ ان دنوں مومنین کا ایک اخبار صدائے بلتستان شائع ہوتا تھا، 7 محرم کو جو خصوصی نمبر آیا اس کے پہلے صفحہ پر علامہ مرحوم کی فل سائز رنگین تصویر تھی اور اس کے نیچے تحریر تھا:

"سفیر سید الشہدا علامہ رشید ترابی"

علامہ صاحب نے اس پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا

اور میرے والد (جو اس وقت پاک محرم ایسوی ایشن کے صدر تھے) کو ہدایت کی کہ آپ میری تقریر سے قبل اس سلسلہ میں قوم کے سامنے صورتحال واضح کیجئے میرے والد نے مجمع کے سامنے وضاحت کی کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، غلط ہے

"علامہ صاحب نے خلافِ معمول، محرم کی تقریر میں فرمایا یہ لقب صرف اور صرف جناب مسلم ابنِ عقیل کے لیے مخصوص ہے علامہ صاحب اس پر سخت ناراض تھے اور کہا مجھے صرف رشید ترابی کے نام سے پکارا جائے میں مرجاؤں گا مگر لوگوں کے دلوں میں زندہ رہوں گا، میری درخواست ہے اگر آپ حضرات اس اخبار کو خریدیں تو جس جگہ پر جہاں سفیر سید شہداء لکھا گیا ہے اس پر سیاہی پھیر دیں"

اسی شام مجلس شام غریباں پڑھنے کے لیے بڑا امام باڑہ کھارادر پہنچے سامنے دفتر کے کمرے میں علامہ صاحب ان کے بڑے صاحبزادے ہادی ترابی، علامہ صاحب کے داماد ڈاکٹر رضا، میرے والد منور عباس صاحب، مولانا علی حاکم، حفیظ صاحب فرنیچر والے مولانا حسن امداد صاحب، مولانا مفتی زین الحسن صاحب، پاڑو بھائی، میں اور میرے بڑے بھائی مظفر عباس اور شاید کچھ اور حضرات بھی ہوں گے سب وہاں بیٹھے مجلس شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے، اچانک اُسی اخبار کے ایڈیٹر کمرے میں داخل ہوئے۔

علامہ صاحب پہلے ہی سے غصے سے بھرے بیٹھے تھے، انھیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور اس وقت کم از کم میں تو علامہ صاحب کا غصہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا، ایک دم لوگ درمیان میں آ گئے علامہ صاحب نے کہا پہلے اس شخص کو یہاں سے نکال دیجئے پھر میں منبر پر جاؤں گا۔

جہاں مجھ گناہ گار نے وہ دور دیکھا ہو جہاں حفظِ مراتب کا حد درجہ خیال رکھا جاتا ہو اور آج جو کچھ ہو رہا ہے احباب مجھ سے زیادہ واقف ہیں، میں صرف رب العزت سے دعا ہی کر سکتا ہوں، علامہ رشید ترابی کے اس شعر پر بات کو ختم کرتا ہوں۔

کارواں جاتا ہے، لے صبح ہوئی چونک رشید
اب کہیں اور جلا جا کے سرِ شام چراغ

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی جب بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے تو جن شخصیات نے جوش ملیح آبادی کو بہت عزت و احترام سے اپنے دل میں جگہ دی ان میں یقینی طور پر پہلا نام میرے والد کا بھی ہے۔ انجمن آرزو کے تحت جو ماہانہ نشستیں ہمارے گھر پر ہوتی تھیں، ان ماہانہ نشستوں کے علاوہ ہر جمعہ کو دو پہر نماز کے بعد والد صاحب کے دفتر میں چند شعراء جمع ہوتے، تمام دفتری سرگرمیاں معطل کر کے شعرو سخن کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ جوش صاحب ان نشستوں کی روح رواں تھے، وہ بہت خوش تھے انھیں اپنی خواہش اور منشاء کے مطابق ایک اچھا ادبی اور شاعرانہ ماحول اور ان کی شاعری کے صحیح قدر دان مل گئے تھے، پھر طے ہو گیا کہ وہ ہر جمعہ کی اس مختصر اور ماہانہ طرحی نشست میں تشریف لایا کریں گے۔

فاصلے دور ہوتے گئے، بے تکلفیاں اور محبتیں بڑھنے لگیں، جوش صاحب اپنی بذلہ سنجی سے سب کو محظوظ بھی کرتے اور سننے والے ان کے اعلیٰ اور بلند پایہ کلام پر سر دھنتے۔ پھر آہستہ آہستہ جوش صاحب میرے والد سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے باہمی تعلقات وسیع تر ہو گئے ایک وقت وہ آ گیا کہ یک جان دو قالب ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد اُن کے جگری دوست ہونے کے علاوہ انتہائی مقرب راز داں بن گئے تھے۔

۱۹۶۲ عیسوی میں ہم ناظم آباد نمبر ۲ میں جامعہ امامیہ کے نزدیک عارضی طور پر ایک کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے اور یہ تمام سلسلے وہاں بھی جاری رہے۔ پھر ۱۹۶۶ عیسوی میں ہمارا مکان بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا میں اور میرے والد کی نگرانی میں بلاک ۱۱ میں جوش صاحب کا ذاتی مکان بن کر تیار ہو گیا۔ جس کے آرکیٹکٹ معروف اردو اور گجراتی زبان کے اور شاعر جوش صاحب کے قریبی ساتھی عبدالحسین تھاریانی صاحب تھے۔

چونکہ جوش صاحب اکثر و بیشتر غریب خانے پر تشریف لاتے تھے اس لئے انکی بہت سی دلچسپ باتیں میرے ذہن کے مختلف گوشوں میں آج بھی محفوظ ہیں، مثلاً مرحوم مرزا عالمگیر قدر جوش صاحب سے بہت زیادہ قریب تھے۔

کچھ دنوں کے لئے دونوں کے درمیان کسی بات پر کچھ خفگی ہوگئی اُس وقت تو میں عمر کے اس حصے میں تھا کہ اس سب کو بہت سنجیدگی سے لیتا اور دل ہی دل میں ناپسند کرتا رہا، لیکن کافی دنوں کے بعد والد مرحوم نے ہنستے ہوئے بتایا کہ یہ محض تفریحاً تھا، مگر مجھے آج تک یاد ہے کہ اس دوران جب کسی نجی نشست میں دونوں کا سامنا ہو جاتا تو جوش صاحب ایک تولیے سے اور عالمگیر چچا رومال سے اپنے چہروں کو ڈھانپے بیٹھے رہتے۔ اس قسم کی تفریحات جوش صاحب نہایت سنجیدگی سے کیا کرتے تھے۔

اتوار کا دن تھا والد صاحب نے دوپہر کے کھانے پر احباب کو مدعو کیا تھا جوش صاحب کو لینے کے لیے گاڑی بھیج دی گئی۔ میرے بڑے بھائی مظفر عباس انھیں لے کر آئے، کچھ دیر بعد دسترخوان پر کھانا لگ گیا سب حیران تھے کہ جوش صاحب اچانک غائب ہوگئے، ہر طرف تلاش کیا گیا پھر پریشانی شروع ہوگئی یکلخت کسی نے اطلاع دی اور گھر کے مین گیٹ کے باہر سڑک پر باہر جا کر دیکھا گیا، ایک گاڑی کے پیچھے زمین پر اکڑوں بیٹھے تھے پوچھنے پر فرمایا:

''ہمارا دل چاہا کہ ہم چھپ جائیں اور کوئی ہمیں ڈھونڈے''۔

جوش صاحب کو میری والدہ کے ہاتھ کے بنی ہوئی قوامی سیوئیاں جن میں پوری دل جمعی کے ساتھ شکر ڈالی گئی ہو، بہت زیادہ پسند تھیں چنانچہ ہر کھانے کے بعد خوب ڈھیر ساری بالائی کے ساتھ کھایا کرتے اور اس چیز میں وہ کسی دوسرے کی شراکت یا حصہ داری برداشت نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا جب دسترخوان پر بیٹھتے تو سب سے پہلے بالائی کا پیالہ اپنے قبضے میں کر لیتے۔

ایک دن نہ معلوم کیا ہوا کہ گھر کے اندر سے یہ پیغام آیا کہ آج بوجوہ بالائی کا انتظام نہ ہوسکا۔ جوش صاحب نے ہاتھ کھینچ لیا اور کھانے سے انکار کردیا۔ آخر جب ایک آدمی جا کر بازار سے بہت تلاش کے بعد بالائی لے کر آیا تب وہ کھانے پر آمادہ ہوئے۔

جوش صاحب کی ایک خاص عادت تھی۔ وہ جب بھی کبھی اپنا کلام پیش فرماتے خواہ سننے والے دو افراد ہی کیوں نہ ہوں ان کا حکم ہوتا کہ ہر مصرعے کو سامنے سے کوئی نہ کوئی با آواز بلند دہرائے ،خود فرماتے ''مصرعہ اٹھاؤ'' اور اگر کبھی اس حکم کی تعمیل نہ ہوتی تو بہت زور سے ڈانٹ دیتے اور بسا اوقات ناراض ہو کر پڑھنا بند کردیتے، میرے والد اس بات سے بخوبی واقف تھے چنانچہ یہ ذمہ داری انھوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔

والد محترم کا حافظہ خداداد تھا جس کا بے شمار افراد اور احباب اعتراف کرتے تھے اور جوش صاحب خاص طور پر اس خوبی سے بے حد متاثر تھے، ایک موقعہ پر جب ایسا ہی کچھ تذکرہ تھا تو فرمانے لگے:

''منور صاحب! آپ سے اچھا حافظہ تو ملا ئکہ کا بھی نہیں ہوگا''

جوش صاحب جب بھی کسی مجلس میں مرثیہ پیش فرماتے تو اختتام مجلس پر مرثیہ کبھی اپنے ہاتھ میں نہ رکھتے بلکہ بجائے اس کے کہ کسی جاننے والے ذمہ دار فرد کے حوالے کرتے وہ کسی کے بھی ہاتھ میں دے دیتے چنانچہ اس طرح ان کے اکثر مرثیے غائب ہو گئے۔ برادر عزیز ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب ''جوش کے انقلابی مرثیے'' میں اس حوالے سے کچھ حقائق بیان کیے ہیں۔

ماہ محرم کے پہلے عشرے کی مجالس سے نشتر پارک میں حضرت علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہٗ خطاب فرمایا کرتے تھے۔ میں نے آغاز میں بھی لکھا ہے کہ جوش صاحب اس عشرے کے دوران تین چار مجالس میں تشریف لاتے اور ایک جانب کرسی پر بیٹھ کر پوری مجلس سنتے تھے اور بقول ان کے وہ ان تقاریر سے اپنے نئے مرثیے کے لئے موضوع اور خیالات چنتے تھے۔

میرے والد کا شوق تو شاعری تھا اور اس فن میں اپنے کلام سے زیادہ دیگر شعراء کے اچھے اشعار کو شوق سے سننا، تعریف کرنا اور یاد کر لینا ان کے مشاغل میں تھا۔ ماشاء اللہ ان کا حافظہ غضب کا تھا لہٰذا کثیر اشعار انھیں ازبر تھے، اور وہ بھی اچھا شعر صرف ایک مرتبہ سنتے اور یاد ہو جاتا، اور اس بات کا اعتراف میرے سامنے جوش صاحب نے بھی کیا تھا۔ لیکن میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا مذہبی رجحان بھی مثالی تھا، خاص طور پر مرثیے کی مجالس میں ذوق وشوق سے جانا، اپنے گھر پر مجالس کا اہتمام کرنا اس کے علاوہ اچھے ذاکرین کی مجالس میں شرکت کرنا انھیں بہت پسند تھا۔

اپنی بے مثال سخن فہمی، سخن گوئی، اچھے شعر کی بھرپور قدر افزائی اور شعراء کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی اور قدر افزائی کی عادت کے سبب سے والد محترم کا حلقۂ اربابِ ذوق بہت جلد انتہائی وسیع ہو گیا تھا بالخصوص اس وقت کے صفِ اول کے شعراء کرام جن سے ان کے بے تکلفی کی حد تک تعلقات اور مراسم ہو گئے تھے۔

ایک وقت وہ آیا تھا جب وزیر اعلیٰ سندھ میر رسول بخش تالپور جوش صاحب سے پرانے تعلقات اور ان کے مقام اور مرتبے کے پیش نظر انھیں اپنے ہمراہ وزیر اعلیٰ ہاؤس لے گئے اور وہ وہیں رہنے لگے تو ظاہر ہے یہ روزانہ کی ملاقاتیں اور بلا جھجک ٹیلی فون پر گفتگو ممکن نہ رہی۔

''جوش صاحب اس صورت حال سے اس قدر پریشان تھے کہ ایک
دن کہہ بیٹھے ہمارا حال کیا پوچھتے ہیں ہم تو کوفہ میں مقید ہیں''

جوش صاحب کے علاوہ جن شعراء سے والد صاحب قبلہ کے گہرے مراسم رہے ان میں ذوالفقار علی بخاری، سیّد آل رضا، نسیم امروہوی، شاہد نقوی، مرزا حامد لکھنوی، نجم آفندی، ارم لکھنوی، رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی، حشم لکھنوی، عزت لکھنوی، مہدی ظہیر، استاد قمر جلالوی، سردار نقوی، راغب مراد آبادی، کرار جونپوری شامل ہیں۔

حجتہ الاسلام مولانا محمد مصطفیٰ جوہر (طاب ثراہ)

maablib.org

علامہ محمد مصطفٰے جوہر صاحب (اعلی اللہ مقامہ)

حضرت مولانا محمد مصطفٰے جوہر اعلی اللہ مقامہ ماضی قریب کے بڑے عالم تھے۔ مولانا کو تحریر و تقریر پر دسترس تھی، فقہ پر ان کو دقیق معلومات تھیں، ان کا علم و فضل اور روحانیت کے وہ تمام احباب معترف رہے ہیں جو مولانا سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا تعلق ہندوستان کے شہر پٹنہ (بہار) سے تھا، کراچی آکر وہ ناظم آباد میں ساکن رہے۔

میرے والد مرحوم اکثر تذکرہ کرتے تھے کہ ان کے دوست رضا حسین ایڈووکیٹ کے گھر واقع فردوس کالونی میں مولانا جوہر صاحب بہت علمی تقاریر کر رہے ہیں، چنانچہ چند مجالس سننے کے لیے میں نے بھی وہاں حاضری دی اور ان کے علم سے سرفراز ہوا۔

مولانا موصوف عالمِ دین وذاکر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اور منفرد انداز کے شاعر بھی تھے۔ دیوان جی جو تنہا سوز خوانی و مرثیہ خوانی کے حوالے سے مشہور تھے اکثر مولانا کا ایک سلام پڑھتے تھے:

کنارے حوضِ کوثر کے شہِ ابرار بیٹھے ہیں
لیے حلقے میں شہ کوشہ کے ماتم دار بیٹھے ہیں
ادھر نامِ حسینؑ آیا اُدھر آنسو ہوئے جاری
مری آنکھوں میں گویا عابدِ بیمار بیٹھے ہیں

میرا دل چاہتا تھا کہ یہ سلام اور کچھ کلام مولانا سے حاصل کرکے ان کی اجازت سے پڑھوں۔ میں نے اپنے عزیز ترین دوست آغا قمر حسنین مرحوم سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ آغا صاحب کو مولانا محترم اپنے فرزند کے مثل سمجھتے تھے اور میں آغا صاحب کا چہیتا تھا وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ میری مولانا سے پہلی ملاقات تھی، یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولانا ناظم آباد سے ترکِ سکونت کرکے حیدری (شمالی ناظم آباد) والے مکان میں منتقل ہو چکے تھے اور بصارت سے بھی محروم ہو چکے تھے۔

جب مجھے ان سے متعارف کرایا گیا تو انہوں نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے بخوشی کچھ سلام عنایت فرمائے اور جب میں نے سب سے پہلے نشتر پارک میں ان کا سلام پڑھا اور پھر ان کی خدمت میں حاضری دی تو انہیں اطلاع مل چکی تھی، مولانا نے تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ کمال ہے آپ نے فراری والا شعر بھی پڑھ دیا ، شعر یہ ہے:

فراری سے نہ یہ پوچھو کہ آخر بھاگتا کیوں ہے
یہ پوچھو بھاگنا طے ہے تو کیوں لشکر میں رہتا ہے

مولانا مصطفےٰ جوہر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی جب بینائی جاتی رہی تو اہل خانہ خصوصاً دونوں فرزندگان (طالب جوہری صاحب اور قاسم جوہری) نے بہت کوشش کی آپریشن کے ذریعہ علاج کرایا جائے لیکن مولانا کسی صورت بھی تیار نہ ہوئے اور "اللہ کی مرضی" کہہ کر صبرو شکر اور ہمت سے زندگی گذار دی۔

لیکن مولانا نے اس وجہ سے کہیں آنا جانا ترک کر دیا تھا، اور گھر کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، انہوں نے ایک سلسلہ شروع کیا کہ ہر سنیچر کی شام کچھ مخصوص احباب وہاں حاضر ہوتے، نماز مغربین با جماعت ہوتی تھی امامت پہلے تو خود مولانا فرماتے تھے بعد میں یہ ذمہ داری طالب جوہری صاحب کو سونپ دی تھی، نماز جماعت کے بعد وہاں جمع ہونے والے تمام حضرات مولانا کے کمرے میں جمع ہوتے کسی کو دین، فقہ اور شرع کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو مولانا بیان فرماتے اور پھر کچھ وقت شعرو شاعری کے لئے ہوتا۔ محترم آغا قمر حسنین صاحب، محترم تقی ہادی صاحب، معجز جونپوری صاحب اور میں مستقل حاضری دینے والوں میں تھے۔ مولانا صاحب خاص طور پر مجھے کچھ سنانے کا حکم فرماتے، جب انھیں بتایا گیا کہ اشرف عباس آپ کے سلام پڑھ کر خوب داد وصول کر رہے ہیں تو مولانا نے خوشی کا اظہار کیا۔

اُنہی دنوں کا واقعہ میں کبھی نہ بھول سکوں گا جس نے مجھے حیران اور ششدر کر دیا کہ ہم لوگوں میں سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا اور مولانا بیان فرما رہے تھے لیکن وہ صاحب کچھ مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ اچانک مولانا نے فرمایا دیکھئے یہ اوپر خانے میں دائیں جانب سے پانچویں کتاب نکالئے کتاب نکالی گئی، فرمایا اس کا صفحہ نمبر فلاں کھولئے اب اس کی ابتدائی سطور ذرا بلند آواز سے پڑھیے، جب یہ پڑھا گیا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی تفصیل وہاں درج تھی ظاہر ہے مولانا محترم کی علمیت، قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، ان نشستوں کا سلسلہ مولانا کے انتقال کے بعد بھی کئی سال تک علامہ طالب جوہری صاحب کے زیر سرپرستی جاری رہا، لیکن پھر علامہ صاحب کی بہت زیادہ مصروفیات کے سبب اسے ختم کرنا پڑا۔

مولانا کے دو صاحبزادے ہیں بڑے جناب ابوطالب (المعروف علامہ طالب جوہری) اور چھوٹے ابوالقاسم جوہری جو محکمہ انکم ٹیکس میں ملازم ہیں۔ طالب جوہری صاحب کے لیے مولانا کی دلی خواہش تھی کہ وہ دینی تعلیم حاصل کر کے اچھے عالم، خطیب و ذاکر بن جائیں۔ حصولِ علم کے لیے مولانا نے طالب جوہری صاحب کو نجف بھیج دیا وہاں بقول طالب جوہری صاحب مولانا ذیشان حیدر جوادی مرحوم، مولانا صادق علی شاہ اور مولانا غلام علی وزیری ان کے ہم عصروں میں تھے۔

حجتہ الاسلام والمسلمین علامہ طالب جوہری

کراچی میں علامہ طالب جوہری گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں اسلامک اسٹڈیز کی درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں اور اس کے ساتھ کراچی کے قدیم محلے کھارادر سے ذاکری شروع کی اور محفل جعفری میں عشرہ پڑھنے کے بعد علاقے کے مشہور ذاکر قرار پائے۔

علامہ رشید ترابی اعلیٰ مقامہٗ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند علامہ عقیل ترابی نے نشتر پارک کی مجالس سے خطاب کیا لیکن بوجوہ یہ سلسلہ برقرار نہ رہ سکا اور میرے والد منور عباس ایڈووکیٹ مرحوم جو پاک محرم ایسوی ایشن کے صدر تھے اس صورتحال سے خاصے متفکر و پریشان تھے۔ غالباً ۱۹۷۵ء کا محرم تھا، والد صاحب کے دیرینہ رفیق نواب افتخار حسین خان نے تجویز پیش کی کہ آج کل مرکزی امام بارگاہ، لیاقت آباد میں ایک نئے ذاکر علامہ طالب جوہری عشرہ مجالس سے خطاب فرما رہے ہیں اور ان کی تقاریر بہت قبولیت حاصل کر رہی ہیں لہٰذا آپ بھی ان کی مجلس سماعت فرمائیں، چنانچہ دونوں صاحبان نے متواتر تین مجالس میں شرکت کی، میرے والد کو وہ مجالس بہت پسند آئیں اور انہوں نے طے کر لیا کہ نشتر پارک میں مجلسِ چہلم سے یہی نئے ذاکر خطاب کریں گے۔ یہ علامہ صاحب کی نشتر پارک میں پہلی مجلس تھی وہ مسلسل خطاب کرتے رہے۔

ان کی مجلسِ چہلم کی خطابت کا مدتوں چرچا رہا اور مداحوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ علامہ صاحب گزشتہ نصف صدی کے معروف بزرگ عالم و ذاکر ہیں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بحق محمدؐ وآل محمدؐ انہیں صحت وسلامتی کے ساتھ طول عمر عطا فرمائے، آمین۔

علامہ صاحب کی خطابت کی سب بڑی خوبی ہے کہ پوری تقاریر آیات قرآنی سے مزین رہتی ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آج مجھے جو بھی قدر و منزلت حاصل ہے میں تاحیات

علامہ رشید ترابی کا مرہونِ منت رہوں گا۔ ان کے بعد ہر عالم، ذاکر اور خطیب نے مجھ ناچیز کو سراہا، لیکن علامہ طالب جوہری کی جانب سے جس قدر عزت افزائی اور حوصلہ مندی وہ میرے لیے قابلِ فخر ہے اور میں ان کا تہہ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔

آپ خطابت و ذاکری کے علاوہ شعر و سخن کا بھی نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی ہیں ان کے تین شعری مجموعے، تفسیر قرآن کی دو جلدیں بنام 'احسن الحدیث'، مقتل کی 'حدیثِ کربلا'، اور علمِ کلام کی کتاب 'عقلِ معاصر' طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں

شاعری کے حوالے سے پیغمبر اکرم کی ولادت کی مناسبت سے آپ کا درج ذیل شعر مجھے بے حد پسند ہے:

آخری پیغام اور دشتِ عرب کا انتخاب
جیسے پتھر کا کلیجہ توڑ کر پھوٹے گلاب

آپ کے تین فرزندگان ریاض جوہری، اسد جوہری اور امجد جوہری اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میدانِ خطابت میں موجود ہیں، اللہ انہیں توفیقِ خیر عطا کرے۔
علامہ طالب جوہری صاحب مدظلہ کا تذکرہ میں نے ان کی شاعری اور شعر و سخن کے حوالے سے دلچسپی اور گہری وابستگی کی بنا پر مختلف مقامات پر کیا ہے مگر بقول خود ان کے:

یہ شوق ہے میرا، میری پہچان نہیں ہے

علامہ طالب جوہری صاحب کی خطابت کا منفرد پہلو اور جوہر، میرے فہم کے مطابق وہ یقیناً حافظِ قرآن ہیں اور بالعموم روایات و واقعات کا سہارا لینے کے بجائے اپنے موقف کے حق میں آیاتِ قرآنی سے دلیل و برہان پیش کرتے ہیں۔

طویل عرصے سے (بعض مواقع کے استثنا کے ساتھ) نشتر پارک میں خطاب فرمارہے ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے تمام اہم مراکز اور کراچی میں امام بارگاہ شاہ نجف مارٹن روڈ، شاہ خراسان، حسینیہ ایرانیاں اور بوتراب امام بارگاہ وغیرہ میں خطاب فرماتے رہے ہیں۔

یادش بخیر کسی زمانے میں پاکستان ٹیلی ویژن سے ان کے "فہم القرآن" کا خاص وعام میں چرچا تھا اور اس پروگرام سے آپ کو قبولیت عام حاصل ہوئی تھی۔ قرآن مجید کے مطالب ومفاہیم کو ہر طبقہ فکر کے اہل علم وعوام نہایت انہماک سے سماعت فرماتے، اسی طرح انہوں نے پی. ٹی. وی اور دیگر نشریاتی اداروں سے مجالس شام غریباں سے بھی سالہا سال خطاب کیا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری وساری ہے بلکہ یہ بھی ہوا کہ اگر کسی وجہ سے وہ کبھی پی. ٹی. وی پر تقریر ریکارڈ نہ کرا سکے تو ارباب اختیار نے ان کی مجلس مکرر نشر کی۔

علامہ طالب جوہری صاحب کے بارے میں اب تو یہ بات تقریباً ہر ایک کے علم میں ہے کہ آپ جتنے بلند پایہ عالم، خطیب ہیں یقیناً اسی پائے کے شاعر بھی ہیں، اب تک ان کی شاعری کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ عام طور پر ان کا کلام میں ہی پڑھتا ہوں، ایک مجلس میں، میں نے جناب اقبال عظیم کا سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا:

خوئے تسلیم و خوئے رضا چاہیے زیرِ خنجر سجود وفا چاہیے
مر کے بھی زندہ رہنا جو مطلوب ہو اتباعِ شہِ کربلا چاہیے

علامہ صاحب نے اس کے بعد مجلس پڑھی اور اس کے ایک یا دو دن کے بعد مجھے فون کرکے بلایا، اس وقت ان کے گھر کی نشست گاہ میں خواجہ کمیل مرحوم، پروفیسر جعفری مرحوم، سیّد سبط حسن زیدی اور چند دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ علامہ صاحب نے باتوں ہی باتوں میں

مجھ سے پوچھا اُس روز آپ نے جو سلام پڑھا تھا "چاہیے" کی ردیف والا یہ کس کا تھا۔ میں نے شاعر کا نام بتایا فرمانے لگے کہ اس کی زمین مجھے بہت اچھی لگی، دل چاہتا ہے اس زمین میں شعر کہنے کو، کیا کوئی قابل اعتراض بات تو نہیں، میں نے عرض کیا کہ اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں، محفلوں میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے ہر شاعر ایک ہی زمین اور ایک ہی ردیف میں شعر کہتے ہیں۔ اس پر انھوں نے ایک کاغذ میرے حوالے کیا اور کہا کہ لیجئے اسے دیکھ لیجئے اگر کسی نے کوئی اعتراض کیا تو آپ ذمہ دار ہوں گے۔ میں نے دیکھا علامہ صاحب کا نیا سلام تھا اس کا مطلع اس طرح ہے:

ہم کو کرسی نہ جاہ و حشم چاہیے، ہم کو دولت نہ دولت سرا چاہیے
وہ خدا جو محمدؐ کی پہچان ہے، اس خدا کی اک ادنیٰ رضا چاہیے

اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ ہوا جس پر میں بہت حیران ہوا تھا، گلشن اقبال میں میرے دوست موسیٰ رضوی کے گھر پر محفل تھی اور صدارت علامہ صاحب کی تھی۔ محفل کے آخر میں مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی جس پر میں بعد میں بہت نادم ہوا۔ اعلان ہوا کہ اشرف عباس اب علامہ طالب جوہری کا کلام پیش کریں گے، میرے پاس علامہ صاحب کا کوئی کلام اس وقت موجود نہیں تھا میں نے کسی کا نام لئے بغیر مولانا حسن امداد کی نظم "العجل" پڑھ دی۔ محفل کے بعد علامہ صاحب نے فرمایا کہ یہ آپ کو کیا ہوگیا، کس کا کلام مجھ سے منسوب کر دیا میں پہلے ہی شرمندہ اور پریشان تھا میں نے اصل بات بتادی، انھوں نے فرمایا کہ گڑ بڑ تو ہوگئی ہے لیکن خیر فکر نہ کریں، کچھ کریں گے ایک ہفتہ کے بعد اس مسئلہ کا حل نکل آیا، شاعر اہلبیتؑ جناب فیض بھرت پوری مرحوم کے داماد نجف سے میرے دوستانہ

مراسم تھے (امریکہ میں مقیم تھے اور ماضی قریب میں راہیٔ ملک عدم ہوئے) انھوں نے اپنے گھر (پاپوش نگر) پر ایک محفل کا اہتمام کیا اور اس محفل کی صدارت بھی علامہ صاحب ہی کو کرنا تھی، یہ واقعہ کم از کم چالیس سال پہلے ہوا۔ جناب محمد عابد عابدی مرحوم علامہ صاحب کے سب سے پہلے سکریٹری تھے اور میرے اور ان کے درمیان بھائیوں جیسے تعلقات تھے، ایسے کہ ہم چوبیں گھنٹے میں ایک مرتبہ ضرور ملاقات کرتے تھے، چنانچہ ہم دونوں نجف کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ علامہ صاحب تشریف لا چکے ہیں ایک الگ کمرے میں آرام کر رہے ہیں اور ہمارا انتظار فرما رہے ہیں، انہوں نے نجف کو بلا کر تاکید کی کہ کم از کم بیس منٹ کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ مجھ سے فرمایا کہ ذرا آپ وہ "العجل" والی نظم یونہی تحت میں پڑھیں میں نے نظم پڑھ دی کہنے لگے اب آپ دونوں حضرات تھوڑی دیر کے لئے خاموش بیٹھے رہیں۔ پھر انھوں نے میرے سلام کی ڈائری اٹھائی، کچھ سوچتے اور اس میں لکھتے رہے اور میں قسمیہ کہتا ہوں کہ پورے بیس منٹ کے بعد ڈائری مجھے دے کر فرمایا لیجئے آپ کی پریشانی کا حل۔ میں نے دیکھا "العجل" کے عنوان سے بالکل اسی انداز پر نئی نظم ہو گئی تھی جو میں نے اس محفل میں پڑھی، یہ نظم میری ڈائری میں علامہ صاحب کی ہی تحریر میں موجود ہے اور معرکتہ لآرا نظم ہے۔

میرا یہ طریقہ ہے کہ میں محرم کی مجالس (نشتر پارک) میں اگر کسی مرحوم شاعر کا کلام پیش کرتا ہوں ان کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھواتا ہوں، ایک دلچسپ واقعہ ہوا، عشرے کی پانچویں مجلس میں علامہ طالب جوہری کا سلام پڑھنا تھا میں نے منبر پر بیٹھتے ہی کہا "حضرت علامہ طالب جوہری کا سلام پیش کر رہا ہوں، ایک سورۂ فاتحہ۔۔۔۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ ایک دم ہوش آیا کہ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں سنبھل کر فوراً ہی میں نے جملہ مکمل کیا۔۔۔ علامہ رشید ترابی مرحوم کے لئے۔ اللہ نے عزت رکھ لی البتہ بعد میں علامہ صاحب نے بڑے خوشگوار موڈ میں ہنستے ہوئے فرمایا "لگتا ہے اشرف عباس اب بوڑھے ہو گئے"۔

مولانا حسن امداد (مرحوم)

میں نے اکثر انجمن ذوالفقار حیدری مولانا حسن امداد کا کلام نوحہ خوانی کے انداز میں پڑھتے ہوئے سنا تھا اور میں اس سے اتنا زیادہ متاثر تھا کہ اکثر دل ہی دل میں خواہش کیا کرتا تھا کہ کاش کوئی نظم یا سلام حسن امداد صاحب مجھے بھی عنایت فرمادیں۔ پھر ایک دن میری یہ خواہش پوری ہوئی، محرم کی نویں تاریخ تھی اور نشتر پارک میں مومنین کا اژدہام تھا، علامہ رشید ترابی منبر کے قریب تشریف فرما تھے، سوز خوانی ہو رہی تھی میرے قبلہ گاہی منور عباس صاحب مرحوم نے علامہ سے عرض کیا کہ سید ناصر جہاں مرحوم پہلی مرتبہ نشتر پارک کی مجلس میں سلام پڑھنا چاہتے ہیں، علامہ صاحب نے انہیں میرے بعد پڑھنے کی اجازت دے دی۔

میرے پاس مولانا حسن امداد کی نئی نظم "تقدم ولدی" تھی، اس نظم میں مجلس میں موجود سامعین پر جو تاثر قائم کیا وہ بیان سے باہر ہے، حد تو یہ ہے کہ مرحوم ناصر جہاں اُس کے بعد پڑھنے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہے تھے، بمشکل اُنہیں تیار کیا گیا لیکن مجمع کا عالم یہ تھا کہ آنسو رکنے سے نہیں رُک رہے تھے، گریہ وزاری سے قیامت برپا تھی، علامہ صاحب کی عنایات تو مجھ ناچیز پر ہمیشہ ہی سے تھیں، لیکن اُس دن اُنہوں نے بے ساختہ مجھے گلے سے لگالیا۔

وہ دن اور آج کا دن میں جس محفل میں اور جس مجلس میں مولانا حسن امداد صاحب کا کلام پڑھتا ہوں میں نے عموماً دیکھا ہے کہ مجمع پر ایک وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ سامعین انتہائی توجہ، شوق اور اثر انگیزی کے جذبے سے سرشار ہو کر سنتے ہیں، میں فخر کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مولانا حسن امداد کا کلام سب سے زیادہ میں نے محفلوں اور مجلسوں میں پڑھا ہے، اور اب بھی موقع محل کے لحاظ سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں،

مولانا کی کوئی نظم کوئی مسدس ایسی نہیں جو میں نے کسی اجتماع میں نہ پڑھی ہو اور میں دعویٰ کر سکتا ہوں ان میں سے ہر ایک کلام نے انتہائی مقبولیت حاصل کی، اس لئے نہیں کہ اسے میں نے پڑھا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کے کلام میں جو ندرت اور جدت آفرینی ہے وہ اسے نہ صرف اور مقبول کرتی ہے، بلکہ عوام الناس کیلئے عام فہم بنا دیتی ہے اور میری اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا کی نظم تقدم ولدی میں گزشتہ ۴۶ سال سے پڑھ رہا ہوں اور اب تو یہ ۹ محرم نشتر پارک کی مجلس کا ایک لازمی جزو بن گئی ہے۔ اس دن مجمع کوئی اور چیز سننے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتا۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ذکر محمدؐ و آل محمدؐ کے صدقے میں جو عزت اور مقام مجھ گنہگار اور حقیر کو رب العزت نے عطا کیا ہے اس میں معیاری کلام کو بھی بڑا دخل ہے اور مولانا حسن امداد کا کلام نمایاں مقام کا حامل ہے۔

علامہ سید رضی جعفر نقوی

ظاہر ہے کسی صورت میں بھی ان سے دوستی کا دعویٰ تو کیا تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ ایک مستند عالم دین، ایک خالص علمی، دینی گھرانے کے پروردہ۔ ناچیز کسی بھی لحاظ سے ان کا ہم پلہ نہیں، میری بے بضاعتی اور کم علمی کے باوجود ان کی شفقتیں، عنایات، مہربانیاں، لطف وکرم، حسن سلوک، محبت آمیز اندازِ ملاقات، بے تکلفانہ اندازِ گفتگو اور انتہائی غیر رسمی طرزِ ملاقات اور ان کی ایسی ہی بہت سے صفات نے مجھ میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ میں انہیں اپنے کرم فرماؤں میں شمار کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔

اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رضی جعفر صاحب کا شمار ہمارے ملک کے صفِ اوّل کے ذاکروں اور علماء میں ہوتا ہے۔ جبکہ میں گزشتہ سطور میں تحریر کر چکا ہوں، ہندوستان کی ریاست بہار کے ایک اعلیٰ علمی اور دینی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد محترم کی خدمت میں نیاز مندی کا اگرچہ مجھے شرف حاصل نہ ہو سکا لیکن ان کی علمی قابلیت اور دینی خدمات کا اعتراف ہر ذی فہم اور باشعور شخص کرتا ہے۔

علامہ رضی جعفر صاحب کے بڑے بھائی جناب آغا جعفر صاحب (مرحوم) کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کا مجھے بیشتر مواقع پر شرف حاصل ہوا ہے۔ ان کی بھی علمی و دینی لیاقت اور ذاتی شرافت کے بارے میں کچھ تحریر کرنے کے لیے میرے قلم میں اتنی جرأت نہیں۔

علامہ جعفر صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان کب تشریف لائے اس کا مجھے نہ تو علم ہے اور نہ ہی یہ واقعہ میری یادداشت میں ہے، بس میرے حافظے میں گمشدہ اوراق میں ایک نامکمل سی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے کراچی میں پہلی مجلس میں خطاب فرمایا تو میں نے سلام پڑھا جس کے لیے انہوں نے اپنی انتہائی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، وہ دن اور آج کا دن یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مجلس میں وہ خطاب فرمانے جاتے ہو اور وہاں

میری موجودگی کا انہیں علم ہو جائے اور پھر میرے سلام پڑھے بغیر وہ منبر پر تشریف لے جائیں۔ اب تو ہمارے تعلقات بے تکلفی کی اس نہج پر ہیں کہ ہمیں کسی موقع پر ساتھ اور بے تکلف بات چیت کرتے دیکھ کر لوگوں کو ہم سے دوستی بھرنے کا گمان کرتے ہیں۔

اس ذیل میں باتیں اور بھی بہت ہیں لیکن میں طوالت سے بچنے کے خیال سے ایک دکھ بھری یادداشت کو ان صفحات پر محفوظ کرنا چاہتا ہوں، جب میں پی ای سی ایچ ایس کے گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا تو رضی جعفر صاحب نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ میں کوشش کر کے ان کے صاحبزادے کو جو آٹھویں جماعت میں پاس کیے ہوئے ہیں داخل کرادوں، میں سلمہٗ کو اپنے اسکول میں داخل کرلیا۔ ماشاءاللہ ذہین تھے دو سال میں بآسانی میٹرک کرلیا، اس بچے نے خوش خلقی، ادب وتہذیب، محبت جیسی خصوصیات باپ سے پائی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا یہی بچہ حسن جعفر تھا، مولانا کے اس اکلوتے فرزند کا ابھی چند برس قبل انتقال ہوگیا۔

آخر میں دو مختصر ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہوں، ایک روز میرے ساتھ جناب ظفر عابدی بیٹھے تھے ایسے میں علامہ صاحب کے نمائندے نے تنظیم المکاتب (رضی جعفر کے زیر سرپرستی چلنے والا دینی وفلاحی ادارہ) کی عنقریب منعقد ہونے والی سالانہ تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ پہنچایا۔ علامہ صاحب نے اپنے دستِ خاص سے تحریر فرمایا تھا 'عندلیب گلستانِ فصاحت' محترم اشرف عباس دام مجدہٗ۔ ظفر عابدی اس لفظ کی تشہیر کرنے لگے جس پر میں نے سختی سے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔

دوسرا پُر لطف واقعہ جس پر بہت سے مومنین کو تعجب بھی ہوا کہ ایک محفل کی صدارت پر فائز جب حسبِ روایت آخر میں صاحب صدر سے فرمائش کی گئی تو انہوں نے حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا جب یہ اعلان فرمایا کہ میں اپنے ایک مختصر قصیدہ کے اشعار لحن سے پیش کرتا ہوں، اور پھر وہاں موجود حاضرین (جن میں یہ ناچیز بھی شامل تھا) نے پہلی مرتبہ انہیں ترنم سے پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ محفل کے اختتام پر میں از راہِ مذاق کہا علامہ صاحب! کیا خیال ہے میں آج سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کردوں، اس پر ہنستے ہوئے بولے میں سوچتا ہوں آج سے کراچی کے سب سے سینئر سلام خواں کی شاگردی کا اعلان کیوں نہ کردوں۔

صادقینِ عظیم

ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں کہ اُنکو رب العزت نے اُنکے شعبے میں بھرپور دوامی عروج عطا کیا پھر دوسرا شخص شاید ہی اُنکے فن کو چھو سکا مثلاً معمار، خطاط، خطیب، شاعر، طبیب، سائنس دان اور دیگر علوم کے ماہر شامل ہیں۔ میں اپنی یاداشتوں کے حوالے سے ایک ایسے شخص کے بارے میں لکھ رہا ہوں جسے میں معمار بھی کہتا ہوں، یہ ایک ایسا معمار ہے جو کسی ایک گھر کا معمار نہیں بلکہ معاشرے کا ایک ایسا مصور ہے جو رنگوں اور لکیروں سے ماضی، حال اور مستقبل کی بات کرتا ہے، کرب و اضطراب، ظلم و استبداد، سماج کے ہاتھوں مجروح انسانیت، نانِ جویں سے محروم لوگ، تقسیم پاک و ہند کی کہانی، شاہی کی تاریخ کو بغیر لب کشائی کے رنگوں کے حسین امتزاج اور ریاضی کے اُصولوں کے مطابق اپنے افکار کو بین الاقوامی سطح پر آشکار کرتا ہے، مجھے یہاں ڈاکٹر بلال نقوی کا بند یاد آ رہا ہے

افکار میرے ہاتھ ہیں اقدار میرے ہاتھ
شہکار میرے ہاتھ ہیں کردار میرے ہاتھ
کر پردہ گاہِ وقت کے اضداد پر نگاہ
اوزار میرے ہاتھ ہیں، ہتھیار میرے ہاتھ

ہمارے دو آئمہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کو صادقین کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں جو ذکر کیا گیا وہ معروف بین الاقوامی مصور، خطاط صادقین کا ہے۔

ہم ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۶ تک ناظم آباد نمبر-۲ میں رہائش پذیر تھے، چند قدموں کے فاصلے پر سبطین منزل تھی یہ صادقین صاحب کا مسکن تھا، آپ کے والد گرامی اور میرے والد (منور عباس) کے انتہائی قریبی مراسم تھے، اس نسبت سے میرا اور میرے بھائیوں کا اُن کے گھر جانا معمول کا حصہ تھا۔

یہ بہت کم افراد جانتے ہوں گے کہ سبطین صاحب (والد صادقین) نہایت عمدہ سوز خواں تھے اور تحت میں مرثیہ بھی پڑھتے تھے، علامہ رشید ترابی کے انتہائی عقیدت مندوں میں شامل تھے اور استثنا کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ اُن کی ہر مجلس میں شریک رہتے تھے۔

میں جب بھی اُنکے گھر گیا دیکھا کہ صادقین صاحب ہمہ وقت اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں، کمروں میں ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور اُن رنگوں کے درمیان صادقین صاحب موجود ہیں، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رنگوں نے صادقین صاحب کو رہنے کے لئے جگہ دی ہے۔ میں رنگ اور لکیروں سے قطعی آشنا نہیں ہوں، اس لیے یہ ایک علم ہے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہیرے کی پہچان جوہری رکھتا ہے، مگر اتنا ضرور میں سمجھتا تھا کہ ان رنگوں کے باطن میں صادقین صاحب کچھ بتانا چاہتے ہیں

صادقین صاحب سے ہم جب بھی ملتے تھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ شخص فنِ خطاطی کا دیو مالا ہے، شخصیت میں عاجزی، سادگی، ملنساری، شفقت و محبت، انسانیت، تکبر سے دور، رحم دلی اُن کی ذات میں بادرجہ اتم موجود ہیں۔

میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ حکومتی عہدیدار یا صاحب سرور دولت مند افراد بغیر وقت لیے اکثر اور بیشتر ملنے آجاتے تھے، آپ کام میں مشغول ہوتے تو اُن کو طویل انتظار کرنا پڑتا کہ جب صادقین صاحب کام ختم کریں گے تب ہی اُن سے مخاطب ہوں گے، کام کے دوران وہ کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے، میں نے اُن کو زیادہ تر گھر ہی میں دیکھا۔

آج بہت سے افراد موجود ہیں جو میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ صادقین صاحب کو پیسے سے رغبت نہیں تھی، وہ اپنی ذات میں فلاحی ادارہ تھے، اُنہوں نے سینکڑوں افراد کی مالی مشکلات میں حاجت روائی کی اور یہ بات اُن کے رہن سہن سے عیاں تھی۔ میں نے اُن کو جب بھی زیب تن دیکھا کُرتہ اور وہ بھی بغیر بنیان کے، بڑے پائنچوں کا پاجامہ اور کبھی شیروانی۔

مجھے ایسے یاد ہے کہ جیسے کل کی بات ہو میرے بھائی اطہر پرویز نے صادقین صاحب سے دستخط کی فرمائش کی آپ نے لمحہ بھر میں کر دیے، اب جو دیکھا تو اطہر پرویز کی تصویر بنا دی تھی جو آج بھی میرے بھائی کے پاس محفوظ ہے۔

اب جو بات میں لکھ رہا ہوں اس کا براہِ راست مجھ سے نہیں میرے پختہ عقیدے سے تعلق ہے، برادرم ہادی عسکری نے بتایا کہ اسکے راوی اُن کے بھانجے محمد علی نقوی (مقیم دہلی) ہیں ۱۹۸۲ میں صادقین صاحب کو وزیر اعظم اندرا گاندھی نے خصوصی دعوت پر ہندوستان بُلایا تھا، آپ کو پانچ روز قیام کرنا تھا مگر آپ تقریباً ۱۴ ماہ وہاں رہے، اس دوران خطاطی کے بیش بہا قیمتی نمونے بنائے، جن میں دو نایاب فن پارے، جن میں ایک پیغمبر اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارک بھی شامل ہیں۔

انا مدینۃ العلم و علی بابہا

شاہِ مرداں، شیرِ یزداں، قوتِ پروردگار

یہ خطاطی کے فن پارے اُن کے بھانجے محمد علی نقوی کے پاس موجود ہیں اور دنیا میں کسی کے پاس نہیں۔ آپ ان خطاطی کے فن پاروں کو امیر المومنین امام علیؑ ابن ابی طالب کے حرم مطہر میں ہدیہ کرنا چاہتے ہیں، برادرم ہادی عسکری نے اُنکی پیشکش حرم کی انتظامی اُمور کے سربراہ کو پیش کردی، الحمد اللہ اُنہوں نے قبول فرمایا اور یہ بھی کہا کہ یہ ایک نایاب اور شاہکار خطاطی ہے اس کو ہم حرم شریف میں موجود عجائب گھر میں مخصوص جگہ پر نصب کردیں گے اور اسی سلسلے میں اس سال ۷ ربیع الاول کو باقاعدہ پُر وقار تقریب میں نقاب کشائی کریں گے۔

یہ سُن کر مجھے بے حد خوشی اور فخر محسوس ہوا اور یہ بات سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ ۱۹۸۲ میں جب صادقین صاحب کو وہم و گماں میں بھی نہ ہوگا کہ وہ جو کام کر رہے ہیں اسکی موضوں ترین جگہ کرہِ ارض پر صرف اور صرف باب مدینۃ العلم کا حرمِ مبارک ہے جہاں آپ آرام فرما رہے ہیں، اب نہ جانے کتنے افراد تا صبح قیامت ثواب میں شریک ہوگئے جن میں یقیناً اُنکے والدین تو سرِ فہرست ہیں۔

صادقین عظیم کی خطاطی کے فن پاروں کو
بارگاہِ امیر المومنین امام علی ابن ابی طالب میں قبولیت نہ کہوں تو کیا کہوں

پروفیسر مولانا تقی ہادی شہید

میں الفاظ کا انتخاب نہیں کر پا رہا کہ اس محترم شخصیت کے لیے کیا لکھوں، میرا اور ان کا ۳۵ برس کا ساتھ تھا۔ بنیادی طور پر وہ اور میں ہم پیشہ تھے، استاد مجھ سے سینئر تھے، میں نے محکمہ تعلیم میں شمولیت اختیار کی جبکہ وہ ایک گورنمنٹ اسکول میں انگریزی کے استاد تھے، پھر وہ مختلف اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے تعینات ہوئے، پھر ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن مقرر ہوئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی قابلیت، تجربے، انگریزی زبان پر عبور اور پیشہ ورانہ امور میں ان کی ہنر مندی کے پیش نظر کراچی سیکنڈری بورڈ نے انہیں کنٹریکٹ کی بنیاد پر بلالیا اور شہادت کے وقت وہ یہی ذمہ داری ادا کر رہے تھے۔

مولانا تقی ہادی صاحب کے لیے اگر میں عالمِ باعمل کا لفظ استعمال کروں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ آپ مولانا مصطفےٰ جوہر قبلہ کے خاص ترین شاگرد تھے اور مولانا بھی انہیں بہت چاہتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

جو حضرات تقی ہادی صاحب سے تھوڑا بہت بھی واقف ہیں وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ان جیسا شریف النفس، سادہ لوح، نیک، باوضع، متقی، پرہیزگار، محبت کرنے والا، سچا اور مخلص انسان اور بہت بڑی صفت کے حامل تھے ان کے سامنے اگر کسی کی غیبت کی جاتی تو وہ سخت ناپسند اور خفگی کا اظہار فرماتے اور موضوع بدلنے کے لیے کہتے تھے۔

وہ انتہائی سادگی کی زندگی گزارتے رہے، اولادِ نرینہ سے محروم تھے چنانچہ اپنے زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ میٹرک بورڈ آفس نے انہیں گاڑی دینے کی کئی مرتبہ پیشکش کی، لیکن انہوں نے قبول نہیں کی ہمیشہ رکشہ اور بعض اوقات بس کے سفر کو ترجیح دی، یہاں تک کہ بعض اوقات مجلس پڑھنے کے لیے جاتے تو بھی یہی سواریاں استعمال کرتے۔

المختصر کہ بقول شاعر: حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا محمد علی نقوی

ایک انتہائی قابلِ احترام، بردبار، متقی، سنجیدہ اور شرع کے عالم اور شیعت کے مراکزِ علوم سے فارغ التحصیل۔ ظاہر ہے اس قدر مستند اور معزز شخصیت کے ساتھ میں دوستی کا دعویٰ کرنے کی تو جسارت نہیں کرسکتا البتہ مولانا کی علمیت، مدبرانہ فکر، حد درجہ صاف اور شائستہ طرزِ گفتگو، دینی امور پر خاطر خواہ دسترس اور انکی باوقار شخصیت سے میں ہمیشہ انتہائی متاثر رہا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ مولانا موصوف بھی اگر مجھ سے محبت نہ بھی کرتے ہوں تو کم از کم ناپسند نہیں کرتے ہونگے۔

میرے دل میں ان کیلئے جو پسندیدگی ہے اس کے زیرِ اثر میں برسوں (جب تک پاکستان میں رہا) نمازِ جمعہ انہی کی امامت میں ادا کرتا رہا۔ مجالس میں وہ ہمیشہ متنازعہ گفتگو سے پرہیز کرتے اور فکر انگیز موضوعات پر گفتگو فرماتے ہیں اور انکی یہ خوبی مومنین کو بے حد پسند ہے۔

دعا ہے کہ پروردگارِ علم انہیں طولِ عمر کے ساتھ صحت وتندرستی عطا فرمائے اور خدمتِ عزاداری کے فریضے کی ادائیگی کی توفیقات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ فرمائے۔ آمین۔

مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی

پرانی طرزوں کے سوزخوان جناب ہاتف الوری کے دونوں فرزندگان جناب عون محمد نقوی اور جناب شہنشاہ نقوی ایک طویل عرصے تک خیر پور (سندھ) میں خدمتِ دینی کا مقدس فریضہ انجام دینے کے بعد جب اچانک کراچی کے اُفق پر طلوع ہوئے تو یہاں کے حضرات کو ذاکری کے میدان میں پذیرائی حاصل حاصل ہوئی۔ دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں۔

مولانا شہنشاہ سے مجھے بہت زیادہ قربت کے مواقع حاصل نہیں رہے، جس میں ان کی مصروفیات، میری کوتاہی، لیکن جب بھی ملاقات ہوتی انتہائی محبت وشفقت سے تعریف و پسندیدگی کا اظہار، فرماتے ہیں۔ چند برس پیشتر ایک واقع نے میرے دل میں ان کی محبت کو اور زیادہ مضبوط کردیا، ۹ رمحرم، نشتر پارک کی مجلس میں حسبِ معمول 'تقدم ولدی' کے بعد شہنشاہ صاحب کو مجلس سے خطاب فرمانا تھا، انتظامیہ نے مجھ سے معذرت کی کہ وقت کی کمی کے باعث آج سلام نہیں ہو سکے گا، میں تو کچھ نہیں بولا لیکن مولانا تک یہ بات پہنچ گئی جو منبر کے قریب تشریف فرما تھے، انہوں نے مجھے وہیں بلا کر ناراضگی کی کیفیت میں فرمایا کہ آپ کسی کی پرواہ نہ کریں منبر پر جایئے اور جیسے پڑھتے ہیں اسی طرح سلام پڑھیں اگر ضرورت ہوئی تو میں تقریر مختصر کردوں گا، میرے لیے یہ سعادت کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔

ڈاکٹر سلمان ترابی

حضرت علامہ رشید ترابی مرحوم کے فرزند ہیں ذاکر اور خطیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ظاہری وضع، چال ڈھال، انداز گفتگو، طرز خطابت وغیرہ میں کسی حد تک اپنے والد گرامی کی شبیہ لگتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ اُن کی خطابت اور ذاکری میں پائی جانے والی فکر میں باپ کی جھلک ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان کا مستقل قیام امریکا میں ہے

لیکن ذاکری کے لیے مختلف ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں جن میں پاکستان سر فہرست ہے ان کا نام یا ذکر سنتے ہی میرے ذہن کے پردے پر وہ ایام نمودار ہو جاتے ہیں کہ جب ہم علامہ صاحب کی کوئی مجلس سننے کے لیے کہیں جاتے تو مجھے حکم ہوتا کہ سلمان میاں کو اپنے ساتھ رکھیں کہیں یہ مجمع میں اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں اس لئے کہ یہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے اور یہ ان کی انتہائی سعادت مندی اور محبت ہے کہ آج بھی مجھ سے اسی طرح پیش آتے ہیں۔

maablib.org

چند زعماء، کرم فرما اور محسنین

آغا قمر حسنین
کلیم آل عبا شاہد نقوی
زاہد فتح پوری
معجز جونپوری
ڈاکٹر ہلال نقوی
نصیر ترابی
شہید پروفیسر سبطِ جعفر
حیدر ترابی
وحیدالحسن ہاشمی
جعفر محسن
نجم الحسن جعفری

پرویز جعفری
علی ظہیر جعفری
انیس عباس رضوی
ظفر عابدی
سید محمد موسیٰ رضوی
سبطِ حسن زیدی
سید شوکت زیدی
اقبال حسین
قمر حیدر
میجر اعجاز مصطفےٰ
نثار مرحوم

جناب سیّد آغا قمر حسنین

آگرہ سے تعلق رکھنے والے آغا صاحب بہت ابتداء ہی میں ہجرت کرکے پاکستان آگئے تھے۔ حکومت پاکستان کی کسی وزارت میں کسی اچھے عہدہ پر فائز رہے اور کچھ عرصہ بعد ہی استعفیٰ دے کر اپنا نجی کاروبار شروع کیا جس میں بہت زیادہ ترقی کی اور آخر دم تک بڑی تن دہی اور سرگرمی سے اس میں منہمک رہے۔ پیڑ پودوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں اور جراثیم کو مارنے والی دوائیں تیار کرنے والی واحد فیکٹری کے مالک آغا صاحب تھے۔

فیڈرل بی ایریا کراچی کے بلاک 6 کے ایک بڑے مکان میں اپنے بڑے سے خاندان کے ساتھ رہتے تھے، میں نے بڑا خاندان اس بناء پر کہا کہ آغا صاحب اپنے نہایت قریبی عزیزوں، بھانجوں، بھتیجوں وغیرہ کو اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتے تھے، اللہ نے انھیں ایک فرزند اور ایک دختر سے نوازا تھا، اور وہ ان دونوں پر جان چھڑکتے تھے۔

آغا صاحب مرحوم کوئی عالم، علامہ، مذہبی اسکالر یا رہنما حتیٰ کہ شاعر بھی نہیں تھے بالکل ایک عام سے انسان تھے اور انتہائی سادگی پسند تھے لیکن اپنی حد درجہ نیکی، شرافت، سادہ لوح، خلوص، دوسروں کی قدر اور عزت کی زبردست عادت کے مدِ نظر ہر خاص و عام میں نہ صرف مقبول بلکہ پسندیدہ تھے۔ میں قسمیہ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ایسے کئی گھرانوں کا مجھے علم ہے جہاں ہر ماہ پورے مہینے کا مکمل راشن وہ خود گاڑی میں لے کر بڑی خاموشی سے پہنچاتے تھے۔

ہر سال ۲۹ محرم کو وہ اپنے گھر پر ایک مجلس کا اہتمام کرتے جو بعد میں شب عزاء میں تبدیل ہوگئی، ابتداء میں کچھ مجالس سے علامہ طالب جوہری اور بعد میں دیگر ذاکرین خطاب فرماتے رہے۔

علامہ طالب جوہری صاحب کو وہ دیوانگی کی حد تک چاہتے تھے۔ اسی دوران میرا بھی وہاں آنا جانا شروع ہو گیا اور پھر ایک وقت وہ آ گیا کہ میں بالکل ان کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ ان کی فیکٹری حب چوکی جبکہ دفتر فلیٹ کلب صدر میں تھا۔ میں ان دنوں جس اسکول میں متعین تھا وہ وہاں سے بہت قریب تھا، چنانچہ آغا صاحب نے مجھ پر پابندی عائد کر رکھی تھی کہ میں اسکول کے بعد ان کے دفتر آ جایا کروں اور دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں، یہ ان کی میرے لئے بے پناہ محبت کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔

آغا صاحب کے داماد احمد علی صاحب ایک بہترین آرکیٹیکٹ انجینئر ہیں، آغا صاحب نے اپنی زندگی میں بیٹی داماد کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا، احمد علی بھی اپنے سسر کی طرح نہایت شریف، نیک، ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں کراچی میں مقیم ہیں اور اکثر ان سے ملاقات رہتی ہے۔ احمد علی کا ایک عظیم کارنامہ جوہر صاحب قبلہ اور آغا صاحب کے مزاروں کی ڈیزائننگ اور اپنی نگرانی میں تعمیر ہے۔ آغا صاحب کے صاحبزادے نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر مجھ سے قطع تعلق کر لیا اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں اور کیسے ہیں۔

maablib.org

کلیم آلِ عبا شاہد نقوی مرحوم

کلیم آل عبا جناب شاہد نقوی اس عہد کے بڑے شاعر تھے، یہ میری ذاتی رائے ہے اور اس سے اختلاف ممکن ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نہ ان کی قدر کی گئی اور نہ انہیں ان کا جائز مقام مل سکا۔ ان کی ایک اعلیٰ خوبی جس کی بناء پر میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں کہ ان کے ناقدین اور مخالفین ان کے خلاف ہرزہ سرائیاں کرتے ،لیکن شاہد صاحب اپنی عادت کے مطابق مخصوص انداز میں ہنس کر ٹال دیتے، انہوں نے کبھی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں اس بات کا بھی معترف ہوں کہ شاہد صاحب حالاتِ حاضرہ اور اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے قریبی احباب میں میر رضی میر، ساحر فیض آبادی، مہدی ظہیر، عزت لکھنوی، ابرار عابد اور میرے والد ماجد منور عباس صاحب شامل تھے۔ ظاہر ہے میں ان بزرگوں کے درمیان طفل مکتب تھا لیکن جب یہ حضرات مل بیٹھتے اور مختلف النوع موضوعات پر گفتگو کرتے تو میری خواہش ہوتی کہ میں بحیثیت سامع اس محفل میں شرکت کرسکوں۔

میرے سن وسال کے تفاوت اور کم آموزی کے باوجود شاہد صاحب مجھے بے حد پسند کرتے تھے، رفتہ رفتہ ان کی عنایات اور مہربانیاں اتنی بڑھیں کہ محافل میں اپنے اشعار خود پڑھنے کے بجائے مجھے حکم فرماتے کہ میں ان کا کلام پیش کروں۔ ان کے چند مقبول ترین سلام اور نوحے آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کس میں ہمت تھی کہ اس راہگزر سے گزرے
مسکراتے ہوئے شبیرؑ جدھر سے گزرے

لوگ قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہے ہیں اب تک
کربلا والے خدا جانے کدھر سے گزرے

....

شاہ کے عزادارو تم کو خوف محشر کیا
ضامنِ شفاعت ہے ایک اشکِ غم تنہا

شاہد صاحب ایسی محافل کے سخت خلاف تھے جن میں شعراء کو مصرعہ طرح پر کلام کہنے پر پابند کیا جاتا ہو وہ کہتے تھے کہ آپ شاعر کو اس بات کا پابند کر دیجئے کہ وہ نئی منقبت یا نیا کلام پیش کرے لیکن طرح کا پابند کرنا مناسب نہیں ایسا لگتا ہے شاعر آپ کا ملازم ہے اور آپ کا حکم ہے کہ وہ بس اسی مصرعے پر شعر کہے گا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی مصلحتوں کا یا تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے مجبوراً چلے جاتے محفل میں مثلاً میرے بھتیجے ذوالفقار جعفری ہر سال اپنے گھر واقع فیڈرل بی ایریا میں ماہ رمضان کے دوران امام حسنؑ کی ولادت کے سلسلہ میں طرحی محفل منعقد کرتے ہیں۔ میں ضد کر کے شاہد صاحب کو اس کی صدارت کے لئے راضی کرتا اور وہ میرے ساتھ چلے جاتے۔ پھر ایک دن آخر کار انھوں نے اپنا فیصلہ سنایا "دیکھو بھائی، بس اب تم ہم سے ضد نہ کرنا یہ طرح وغیرہ میں اب ہم سے شعر نہیں ہوتے" اُس سال محفل کے لئے صرف ایک ردیف دی گئی تھی "کیا کیا جائے" کافی دیر خوشامد کے بعد میں نے انھیں اس بات پر رضا مند کر لیا کہ وہ صدارت کریں اور آخر میں اپنی کوئی بھی منقبت سنا دیں، یہ بات صبح نو بجے ہوئی اور میں اپنے گھر آ گیا، سہ پہر چار بجے محفل میں جانا تھا، میں نے انھیں ان کے گھر سے لیا میرے ساتھ میرے دوست ظفر عابدی بھی تھے، گاڑی میں بیٹھ کر شاہد صاحب نے شیروانی کی جیب سے کاغذ نکال کر مجھے دیا اور کہنے لگے لو یہ چند شعر ہوئے ہیں تم ہی پڑھ دینا، میں اس وقت ڈرائیونگ کر رہا تھا اس لئے پڑھ نہ سکا جیب میں رکھ لیا۔ محفل کے آخر میں وقت بہت کم رہ گیا تھا مغرب کی اذان ہونے والی تھی لہٰذا میں نے پہلی مرتبہ بغیر ترنم کے وہ منقبت پڑھی اُسی مقررہ ردیف میں کہی گئی منقبت نے گویا محفل لوٹ لی اور خاص طور پر اس کا یہ شعر بہت سے لوگوں کے اذہان میں آج تک محفوظ ہے:

امیر شام نے مانگا ہے تخت شبرؑ سے
حقیر چیز ہے انکار کیا کیا جائے

میں نے اوپر ان کی وسعت قلبی کا تذکرہ کیا، وہ کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے، ان کی فراخدلی کی ایک جیتی جاگتی مثال خود میرے سامنے پیش آئی۔ ان کی ایک منقبت خود مجھے بہت پسند ہے لیکن ظاہر ہے اس میں مصائب کے اشعار نہیں تو مجلس میں نہیں پڑھ سکتا تھا، میں نے ایک دن گستاخانہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود مصائب کے دو شعر کہے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا، بہت ڈرتے ڈرتے پوری بات ان کے گوش گزار کی اور اشعار بھی سنائے، وہ بڑے سکون سے سنتے رہے، چند الفاظ کے ردو بدل کے بعد تعریفی کلمات سے نوازا اور فرمایا: آج سے تمہیں پوری اجازت ہے میرے کسی بھی کلام میں مصائب کے اشعار کا اضافہ کر سکتے ہو، صرف ایک نظر مجھے دکھالینا، چنانچہ میں ان کی متعدد منقبتیں کچھ اضافے کے ساتھ بطور سلام مجلس میں پیش کر چکا ہوں، البتہ یہ سب ان کی اجازت سے ہوا، ان کی زندگی کا آخری نوحہ جو انہوں نے مجھے مرحمت فرمایا وہ ان کے گھر پر منعقد ہونے والی سالانہ مجالس کے آخری دن پڑھتا ہوں، جو انہوں نے خود بھی بہت پسند کیا تھا:

اے زینب دلگیر خدا حافظ و ناصر

''کلیم آلِ عبا'' یہ لقب شاہد نقوی صاحب کو ان کی گرانقدر خدمات اور ان کی بہترین اور اعلیٰ ترین شاعری کے اعتراف میں علامہ طالب جوہری نے دیا تھا، اور اس سلسلہ میں ایک باوقار تقریب میں آغا سیّد قمر حسنین صاحب کے مکان پر منعقد کی گئی تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اور شاعری کی کچھ تھوڑی بہت سوجھ بوجھ ہوئی اسی زمانے سے میں شاہد صاحب کو سُن رہا تھا اور مجھے ان کا کلام بہت اچھا لگتا تھا، وقت گذرتا گیا اور آہستہ آہستہ میں ان سے بہت قریب ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ کا کرم یہ ہوا کہ میرے پڑوس میں ان کا مکان بن کر تعمیر ہو گیا اور وہ یہاں منتقل ہو گئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے مجھے ان کی خدمت میں حاضری کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملنے لگے۔ ان کا کلام جس اعلیٰ معیار کا ہوتا تھا اس کا تو ایک عالم معترف تھا لیکن یہ بات میں زیادہ بہتر جانتا ہوں کہ وہ انتہائی زود گو تھے اور جتنی دیر میں دوسرے سوچتے رہ جاتے، ان کے یہاں شعر ہو جاتا اور اس کا بسا اوقات مجھے تجربہ ہوا۔ میں پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے بہت چاہتے اور میرا بہت خیال کرتے تھے۔

جناب زاہد فتح پوری اور ان کے فرزندگان

زاہد صاحب مرحوم بہت سینئر، صف اول کے مانے ہوئے اور مستند شاعر مجھ سے بہت سینئر تھے اس لئے میں انھیں دوست تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مجھ پر عنایات، محبتیں، نوازشات اس قدر تھیں کہ ہمارے گہرے مراسم سے بھی واقف تھے، امام زمانہ کی مدح میں ان کے اس شعر کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی:

زاہد بھی نذر کر دے گلدستہ منقبت کا
اتنا کوئی بتا دے گذریں گے وہ کدھر سے

زاہد صاحب کے فرزندگان ابرار حسین، مختار حسین، زوار حسین اپنے والد کی طرح اسی مزاج اور طبیعت کے حامل ہیں سن وسال میں مجھ سے کم ہیں، بڑی محبت اور عقیدت اور احترام کی حدوں میں ملتے ہیں۔ تعارف کے محتاج نہیں ابرار حسین فتح پوری سوز خواں، اور ان کے بھائی مختار حسین نوحہ خواں ہیں، ابرار حسین بیرون ملک میں بے حد مقبول ہیں اور گذشتہ کئی برسوں سے ایام عزا میں انہی مقامات پر سوزخوانی کے لیے جاتے ہیں اور اب زاہد صاحب کی تیسری نسل کے نمائندہ ابرار کے صاحبزادے اظہار حسین ابھر کر سامنے آئے ہیں اور کافی مشہور ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان بھائیوں کا اقبال بلند کرے۔

معجز جونپوری مرحوم

عام طور پر ایک اچھے اور صاحب طرز شاعر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ لیکن میرے ساتھ نہایت گہرے دوستانہ اور قریبی تعلقات تھے، وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے بے حد سادہ طبیعت اور مزاج کے حامل تھے سادگی پسندی کا حال یہ تھا کہ ساری زندگی یا تو بسوں میں یا پیدل سفر کرتے گزاردی، میری طرح وہ بھی آغا قمر صاحب کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ شاعری میں انھیں نمایاں مقام حاصل تھا مجھے ان کا ایک شعر بہت پسند ہے:

بچپنے سے ہی رہا معجز یہ اپنا مشغلہ
اک عزا خانے سے نکلے، اک عزا خانے گئے

ڈاکٹر ہلال نقوی

پاکستان بھر کے علمی وادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت، اپنے مخصوص طرز کے واحد شاعر، علم و فن، طرز اور اسلوب سے ہٹ کر بالکل منفرد انداز میں مرثیہ نگاری کے ہیرو اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے خاص شاگرد اور مقرب خاص۔ ہر خاص وعام اس بات کا معترف ہے کہ جوش کے بارے میں جتنا کام ہلال بھائی نے کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں، وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ جہاں تک میری معلومات ہیں جدید اردو مرثیہ پر مفصل تحقیقاتی کام مقالہ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ہے جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی سند کراچی یونیورسٹی نے دی اور واحد شخصیت ہلال بھائی کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تقریباً ۴۵ سال پرانے مراسم ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ سراج الدولا کالج میں اردو کے لکچرار تھے۔ پھر میری خوش نصیبی کہ کچھ عرصہ بعد وہ میرے پڑوسی بھی بن گئے، اور جب جوش صاحب کی میرے یہاں آمد ہونے لگی تو ہلال بھائی بھی پابندی سے آتے رہے۔

ایک دلچسپ بات یہ کہ میرے والد ان سے اور وہ میرے والد سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ میرے گھر پر ہر سال مرثیے کی ایک مجلس ایام عزا میں ہوتی تھی جس میں جناب سید آل رضا مرثیہ پڑھتے تھے، ان کی رحلت کے بعد میرے والد نے ہلال بھائی کا انتخاب کیا، اور جب تک میرے والد زندہ رہے یہ سلسلہ جاری رہا، اور اس کے بعد بھی اسی طرح جاری رہا۔ پھر اپنی مصروفیات کے سبب ہلال بھائی نے معذرت کی جس کے بعد امید فاضلی مرحوم سردار نقوی مرحوم، سبط حسن انجم مرحوم، شاہد نقوی مرحوم، اور جناب احسن ذوالفقد جونپوری نے ان مجالس میں مرثیے پیش کئے۔ میرے بیرون ملک آنے کے سبب یہ سلسلہ رکا ہوا ہے۔

جیسا کہ اوپر کی سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ میری جو یہ ایک ادنٰی سی کوشش کتابی شکل میں قارئین کے سامنے ہے، اس کا خیال اور اس کی طرف میری توجہ مبذول کرانے کا بنیادی عنصر ڈاکٹر ہلال نقوی کے سر ہے۔

ان کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہیں تو یہ غلط نہ ہوگا، شاعر بھی، تصنیف وتالیف کے میدان کے بے مثال شہسوار، گفتار و کردار کی بہترین صفات کے حامل۔

اردو زبان کے موجودہ عہد کے نمائندہ اور درخشاں ستارے، رثائی ادب اور جوش شناسی جیسے ادبی رسالوں کے ایڈیٹر، ان کے بے مثل مرثیے، سلام، نظمیں، نوحے وغیرہ طرز سخن میں ان کی بے مثل کارکردگی کی نمایاں مثال ہیں ان کا کہا ہوا بے مثل نوحہ:

"جا کے کہہ دو کہ دریا پہ ہم آئے ہیں"

بچے بچے کو یاد ہے، جس کو مرحوم جعفر بھائی نے پڑھایا تھا۔ ان کے دو بہترین مرثیے بعنوان "ہاتھ اور الحمد" اردو مراثی کے شاہکار ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر کی وزیٹنگ فیکلٹی میں بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ان کی رباعیات بہت خوبصورت اور حقیقت سے بہت قریب ہیں۔

اسلام کا پیغام نہیں آ سکتا
ایمان بھی کچھ کام نہیں آ سکتا
جس ملک میں ہوں بغض علی پر جلسے
اس ملک میں اسلام نہیں آ سکتا

نصیر ترابی

حضرت علامہ رشید ترابی مرحوم کے فرزند اردو شعرو شاعری کے ایک مضبوط ستون، فہم و فراست کے مالک، نہایت مدبرانہ سوچ کے حامل دانشور، اگر میں یہ کہوں کہ ان کا شمار اُردو کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے تو قطعی طور پر حق بجانب ہوں گا۔ وہ اپنی طرز کے منفرد شاعر ہیں اور غزل، نظم اور سلام میں انھوں نے ہمیشہ دوسروں سے ہٹ کر بالکل جداگانہ طرز اور روش اختیار کی ہے۔

مجھے برسوں اُن کا پڑوسی ہونے اور اُن سے کچھ سیکھنے اور جاننے کا شرف حاصل ہے۔ میں عمر میں ان سے بڑا ہوں لہٰذا انھوں نے ہمیشہ مجھے عزت دی اور 'اشرف بھائی' ہی کہا یہ ان کی محبت ہے کہ انھوں نے اپنے کئی سلام مجھے مرحمت فرمائے جو میں اکثر پڑھتا ہوں ان کا سلام:

یہ تیغ یہ کتاب یہ سجدہ علی سے ہے

آج بچے بچے کی زبان پر ہے ایک اور سلام مجھے بہت پسند ہے اور بہت مقبول ہو چکا ہے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

یہ ہے مجلس شہِ عاشقاں کوئی نقدِ جاں ہو تو لے کے آ
یہاں چشمِ تر کا رواج ہے دلِ خونچکاں ہو تو لے کے آ
یہ فضا ہے عنبر و عود کی یہ محل ہے وردِ دُرود کا
یہ نمازِ عشق کا وقت ہے کوئی خوش اذاں ہو تو لے کے آ

شاعری کے علاوہ مضمون نگاری، مقالہ نویسی اور دیگر اصناف میں بھی ان کی نمایاں حیثیت و اہمیت ہے۔ ان کی تصنیف جو "شعریات" کے نام سے شائع ہو چکی ہے ایک نادر اور منفرد اضافہ ہے اُن لوگوں کے لیے جو شعرو سخن سے وابستگی اور شغف رکھتے ہیں۔ میرے ذہن میں ہمیشہ ان کا مقام ایک نہایت معزز اور محترم شخصیت کا رہا ہے۔

پروفیسر سیّد سبطِ جعفر زیدی شہید

دل میں جگہ بنانے والی اس عظیم شخصیت سے کون واقف نہیں اس کے لیے کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ نہایت لائق، تعلیمی قابلیت ایم اے ایل ایل بی کالج کا پروفیسر اور پرنسپل، قابلِ تحسین سوز خواں بہترین شاعر دوستوں کا دوست، بذلہ سنج شخص کی منفرد شخصیت کا طرۂ امتیاز اس کی زعفران زار صفت تھی۔ جس محفل میں وہ موجود ہوتا وہ بہت خوشگوار اثر قائم کرتی کسی غیر سنجیدہ بات کو اتنی سنجیدگی سے کہتا تھا کہ لوگ ان پر یقین کر بیٹھتے۔ باتوں باتوں میں طنز و مزاح اُس کا اہم ترین خاصہ تھا۔ میں اپنے ساتھ اس کی محبتیں عزت و احترام کا برتاؤ کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی قبر پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرماتا رہے۔

حیدر ترابی مرحوم

ایک اچھے بڑے معروف اور ذی حیثیت کاروباری شخصیت اور ایک مقبول اور پسندیدہ ذاکر، بے پناہ خوبیوں کے مالک، انتہائی خوش گفتار اور بذلہ سنج شخصیت۔ خوجہ برادری سے تعلق اور مادری زبان گجراتی ہونے کے باوجود نہایت صاف ستھری اور شستہ اردو زبان بولتے، مجلس پڑھتے تو یقین نہیں آتا تھا کہ اردو ان کی زبان نہیں، میرے ان سے برسوں کے پرانے دوستانہ مراسم رہے۔

وہ علامہ رشید ترابی کے بہت بڑے مداح اور دل و جان سے عقیدت مند اور مجھ ناچیز کے مداح تھے۔ چند سال پیشتر ترابی صاحب کی رہائش گاہ پر شب عاشور کی مجلس پڑھ کر گھر جاتے ہوئے ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہوئے اور پھر ہوش میں نہ آ سکے، پروردگار ان کی مغفرت فرمائے۔

وحیدالحسن ہاشمی مرحوم

میرے بزرگ ایک محبت کرنے والی شفیق و مہربان انتہائی معتبر شخصیت، صف اول کے ایسے شاعر جن کے ذخیرۂ کلام میں ہر صنف کے نمونے ملیں گے۔ ان کی نعتوں، مناقب، سلام اور مراثی کے الگ الگ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ مجھے ذاکرِ حسینؑ کا درجہ دے کر اسی طرح عزت دیتے تھے۔ ایک محفل میں انھوں نے منقبت پڑھی جو میں نے اسی وقت لکھ لی اور آخر میں اسی محفل میں اپنے انداز سے پڑھنے کی اجازت چاہی جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے وعدہ فرمایا کہ وہ اس کے علاوہ بھی اپنا کچھ اور کلام مجھے مرحمت فرمائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے لاہور جا کر (جہاں وہ مستقل رہائش پذیر تھے) پہلے سے شائع شدہ نعت، منقبت سلام وغیرہ کی جملہ کتابیں مجھے ارسال کیں اور پھر جب تک زندہ رہے جب بھی کوئی نیا سلام ہوتا بذریعہ ڈاک مجھے بھیج دیتے۔ میں نے ان کے کئی سلام مجالس میں پڑھے اور اب بھی پڑھتا رہتا ہوں جن میں مندرجہ ذیل کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے:

چلو حسینؑ سے پوچھیں کہ زندگی کیا ہے
ہر مرض کی درِ حیدرؑ پہ دوا ملتی ہے
کیا ہے علیؑ یہ خلقِ پیمبرؐ بتائے گا
سارا جہاں حسینؑ کی مٹھی میں بند ہے

حضرت علامہ طالب جوہری نے ایک تقریب میں انھیں ''وحید مودت'' کے خطاب سے نوازا تھا۔

ڈاکٹر جعفر محسن شہید

ذوالفقار حیدری کے بانی رکن، ایک مرد مومن اور دوسرے مومنین کے لئے دل میں خاص محبت رکھنے والی شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی اصل وجہ شہرت ان کی وہ خدمات تھیں جو وہ مسلسل قافلہ زیارات عمرہ اور حج کے لیے فراہم کر رہے تھے اس سلسلہ میں مومنین کو تمام تر سہولیات فراہم کرنا اور انھیں آرام پہنچانا ان کی اولین کوشش ہوتی تھی۔ مجھے ایران، عراق، کربلا کی زیارات اور عمرے کا شرف انہیں کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

نجم الحسن جعفری صاحب

جناب علی متقی جعفری مرحوم کے نام سے کون واقف نہیں ہوگا پیشہ ورانہ حیثیت تو یہ کہ آپ عدلیہ کے جج تھے، لیکن اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ شہرت یہ ہے کہ شہر میں صبح آٹھ بجے ہونے والی سب سے بڑی مجلس کے بانی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ نجم الحسن جعفری عرف نجن بھائی جو علی متقی صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں، کاروباری شخصیت اور عزاداری خدمت کا جذبہ رکھنے والی شخصیت ہیں۔

والد گرامی کے قائم کردہ عشرۂ مجالس کو تا حال اسی شان و شوکت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ابتدا سے اس وقت تک (جو پچاس سال کا عرصہ بنتا ہے) ان مجالس سے خطاب فرمانے والے خطباء میں علامہ رشید ترابی، مولانا نقن صاحب، مولانا غلام عسکری صاحب، مولانا مرزا محمد اطہر، مولانا سہیل زیدی، علامہ طالب جوہری، اور اب گذشتہ بیس برس سے ہندوستان کے عالم دین علامہ عقیل الغروی یہاں کے مومنین کو فیضیاب فرما رہے ہیں اس کے علاوہ ۱۸، ۱۹، اور ۲۰ رمضان شبوں کی تین مجالس باقاعدگی سے ہوتی ہیں۔

۸ محرم کی صبح اور شبوں کی تینوں مجالس میں ایک عرصہ دراز سے مجھے سلام پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ اللہ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

محمد پرویز جعفری مرحوم

یہ میرے بہت دیرینہ رفیق وانتہائی محب اور بے حد پیارے اور مخلص دوست تھے جو کہ سن میں مجھ سے کافی چھوٹے تھے، اس لیے میں نے ہمیشہ برادرِ خورد نہ صرف کہا بلکہ دل سے سمجھا اور انہوں نے بھی مرتے دم تک اس رشتے کا پاس کیا۔ اور پھر یہ تعلقات اتنے وسیع ہوتے گئے کہ ہمارے درمیاں گھروں جیسی بات ہوگئی۔ ان کا بھائی وسیم اور مرحوم کا بیٹا عباس اور بیوہ آج بھی مجھے اپنے گھر کا ایک فرد مانتے ہیں۔

مرحوم رشتے میں آغا قمر حسنین کے سگے بھانجے تھے، عرصۂ دراز تک علامہ طالب جوہری صاحب کے سکریٹری کے فرائض بہ حسن وخوبی نبھاتے رہے۔ یوں تو آغا صاحب کے مکان روشن منزل پر ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن زیادہ میل ملاپ شروع ہوا جب سے کراچی کے علاقے کریم آباد میں فلیٹوں میں منتقل ہوئے، بعد میں انہوں نے فیڈرل بی ایریا بلاک ۱۱ میں مکان خرید کر مستقل رہائش اختیار کی۔ میں یہ بات کسی بڑے پن یا مکر سے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ان کی زندگی میں بھی اور آج بھی اس گھرانے میں انتہائی اہمیت مجھے حاصل رہی ہے۔ ہر سال ۲۵ رصفر کو ان کے گھر ہونے والی مجلس اور شب بیداری تمام شہر میں لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی اور ہے۔ افسوس کہ میرے اس دوست کی زندگی نے وفا نہ کی اور مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہوا۔

علی ظہیر جعفری

آغا قمر حسنین مرحوم کے انتہائی قریبی عزیز اور کاروبار میں معتمد ساتھی۔ میرے بھی گھرے مراسم رہے ہیں، بہت محبت کرنے والے عبادت گزار سچی اور کھری طبیعت اور بہت سی خوبیوں کے مالک۔

انیس عباس رضوی

علم دوست اور سخن شناس، صاحب مطالعہ درویش صفت، ہمدرد، صاف گو شخصیت کے مالک ہیں۔ علامہ رشید ترابی اُنکے بھی محبوب خطیب ہیں اور ان کی قربت حاصل رہی اور علامہ کے ساتھ سفرِ ایران کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ ۱۹۶۰ سے ۷۰ کی دہائی والے مجلسی سامعین خالقدینا ہال کی مجالس اسکی اہمیت وافادیت سے بخوبی واقف ہیں۔ اُن دنوں انیس عباس جوان تھے اور ایک جوانوں کے گرو کے فعال رکن بھی، یہ گروہ پابندی سے علامہ رشید ترابی کی مجالس میں شرکت کرتا تھا۔ علامہ وقت کے بہت پابند تھے، خاص طور سے خالقدینا ہال میں ایک مرتبہ اُستاد معشوق علی خان نے دو منٹ زیادہ لے لیے تو علامہ مرحوم نے اُن سے اُسی وقت کہہ دیا، لیکن جوانوں کا مذکورہ بالا گروہ کم از کم دو مرتبہ مختلف مجالس میں چند منٹ کی تاخیر سے پہنچا تو اُس نابغہ روزگار خطیب نے اپنا خطاب کچھ لمحوں کیلیے روک دیا، جب تک یہ جوان اُس کھچا کھچ مجمع میں بیٹھنے کی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ شرف کم ہی کسی شخصیت کو ملا ہوکہ علامہ مرحوم اپنا بیان روک دیں۔

حضرت جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر علی شریعتی اور دیگر علمی وادبی شخصیات کے ساتھ حد درجہ کا علمی لگا ہے، صرف پاکستان ہی نہیں نجف کے علماء کیساتھ بھی طویل عرصے سے قریبی تعلق وابستہ ہے۔ میرا او انیس عباس کا برسا برس کا ساتھ ہے، قومی ہوائی کمپنی میں ایک عرصہ کام کرنے کے بعد رخصت حاصل کی اور مجالس پڑھنے کا آغاز کردیا جو سفر کامیابی سے جاری ہے۔ ذاکری کا پہلے بھی شوق تھا اور اب باقاعدہ ذاکر ہیں۔ ان کی مجالس سے سامعین کوئی نہ کوئی فکری نکتہ لے کر ضرور اٹھتے ہیں۔

ممتاز مورخ و دانشور جناب ڈاکٹر حسین محمد جعفری اور پروفیسر شائستہ زیدی صاحبہ ان کی جرأتِ اظہار کے معترف رہے ہیں۔ سخن فہمی کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور حضرت جوش ملیح آبادی کے ارادت مندوں میں سے ہیں۔

شاعر اہلبیتؑ ظفر عابدی

میرے ایک دیرینہ ساتھی اور رفیق نہایت مخلص، سچے ایماندار بہت محبت کرنے والے ہر حال میں ساتھ دینے والے، اور ایسی ہی کئی خوبیوں کے مالک اور پھر ان سب کے ساتھ ایک اضافی صفت یہ کہ بہت اچھے اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کے سلام اور نوحوں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے اور کچھ ماتمی انجمنوں نے ماضی میں ان کے نوحوں پر داد وصول کی ہے۔

سیّد محمد موسیٰ رضوی

کافی عرصہ تک کراچی میں ایرانی قونصلیٹ میں کام کرتے رہے۔ فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل ہے مشہور و معروف فارسی کتب بالخصوص ڈاکٹر علی شریعتی کی کتابوں کے اُردو تراجم کرتے رہے ہیں جن میں بیشتر منظر عام پر آ چکی ہیں یہ بھی میرے کالج کے ساتھیوں میں سے ہیں۔

سبط حسن زیدی

میرے دیرینہ رفیق، میرے مداح بھی۔ ۲۰ رمضان کو شہادت امیر المومنینؑ کے سلسلہ کی مجلس اور جلوس کے بانی عیوض علی مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں اور اسی سلسلہ کو تادم تحریر اسی اہتمام سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

سید شوکت زیدی

رٹیائرڈ کمشنر انکم ٹیکس میرے کالج کے ساتھی، حالیہ مقیم امریکا۔

اقبال حسین

رضویہ کے بہت پرانے رہائشی ماجد حسین اور رضویہ ٹرسٹ کے سابق ٹرسٹی شاکر حسین اپنی شخصیات کے حوالے سے بے حد مشہور ہیں۔شاکر صاحب کی صاحبزادی پروین شاکر کے نام سے کون واقف نہیں مندرجہ بالا دونوں صاحبان کے بھانجے اور پروین کے فرسٹ کزن اقبال حسین صاحب سے تقریباً ۴۵ برس پرانے تعلقات ہیں۔وہ کبھی مجھے اپنا دوست نہیں کہتے۔انھوں نے بہت زیادہ تعلقات اور مراسم ہونے کے باوجود ہمیشہ عقیدت اور احترام کی عظیم ترین مثال قائم کر رکھی ہے۔آج کل علیل ہیں اللہ انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔

قمر حیدر

انجمن ذوالفقار حیدری کے سابق صدر، میرے دوست بھی، کرم فرما بھی محسن بھی اور مداح بھی۔

میجر (ریٹائر) اعجاز مصطفٰے

سب سے پہلا تعارف تو یہ کہ جناب ماجد رضا عابدی کے سگے بڑے بھائی ہیں۔ پاکستان آرمی سے ایک عرصہ تک وابستہ رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ ابتدا ہی سے رہائش کا مرکز لاہور رکھا، ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں ڈیفنس لائبریری کے نگراں رہے۔

میں نے ان کا نام اور رشتہ کا حوالہ سن رکھا تھا مگر ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑا عرصہ ہوا جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی پتہ چلا کہ وہ پہلے ہی سے میرے مداح اور مجھے دیکھنے اور مجھ سے ملاقات کے خواہشمند تھے۔ بس پھر تو تعلقات اور ملاقاتوں میں تیزی اس طرح آئی کہ میں اپنے بیٹے کے پاس دبئی میں تھا اور وہ اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلہ میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران انکشاف ہوا کہ وہ جوش اور اقبال کے گرویدہ اور علامہ رشید ترابی کے انتہائی معتقد ہیں۔باتوں باتوں میں ذکر آیا کہ ڈاکٹر ہلال

نقوی کئی سال سے مجھ سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں اپنی گذشتہ پچاس سال کی یادداشتیں تحریری شکل میں لاؤں اور اب علامہ طالب جوہری صاحب نے بھی اس حکم کی توثیق فرمائی ہے۔ بس اس روز سے میجر صاحب کا یہ معمول بن گیا کہ وہ ہر ملاقات میں اور گاہے گاہے فون پر یہ اہم ترین کام یاد دلاتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ چند صفحات معرضِ وجود میں آئے۔

میجر اعجاز ایک انتہائی نفیس، سنجیدہ اچھے تعلیم یافتہ مطالعہ کے شوقین معاملہ فہم ذہین اور سخن فہم شخصیت کے مالک ہیں، اور اپنے حلقۂ احباب میں بے حد معروف اور پسندیدہ ہیں۔

نثار مرحوم

ایک اور اچھا اور مخلص دوست عقیدت مند اور مداح ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ احترام عقیدت اور قدر کا رشتہ قائم تھا۔ ہر سال یکم تا ۸ محرم بعد نماز مغربین گھر پر نوحہ و مرثیہ خوانی کی ایک مختصر مجلس ہوتی تھی جس میں ایک یا دو نوجوان مرثیہ خوانی کرتے اور آخر میں چند کلام میں پڑھتا اور اس پر اختتام ہوتا۔ میں نے مسلسل ۳۲ برس وہاں شرکت کی، چار سال قبل نثار اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تلخ یادیں

میری زندگی کے کچھ واقعات و لمحات ایسے ہیں جن کی یادیں بہت تلخ ہیں اور جنھوں نے گاہے گاہے میری زندگی میں زہر گھول دیا، لیکن صرف اس خیال سے کہ کہیں کسی کی دل آزاری کا سبب نہ بن جائیں۔ میں اس دعا کے ساتھ ان تمام باتوں کو پسِ پشت ڈال رہا ہوں کہ اللہ ان سب کو نیک اور راہِ ہدایت دکھائے۔ میں ان سب کو دل سے معاف کرتا ہوں جنھوں نے مجھے تکلیفیں پہنچائیں۔ اگر میری ذات سے، کسی بات سے یا کسی عمل سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں دل کی گہرائیوں سے معذرت چاہتا ہوں:

کیا بتاؤں کش مکش کب سے حق و باطل میں ہے
یہ فسانہ کچھ زباں پر ہے، بہت کچھ دل میں ہے

(علامہ رشید ترابی)

عظیم سعادت سفرِ عراق

بعض احباب کی خواہش اور اصرار شدید پر میں نے اپنی بھولی بسری کچھ یادیں سپردِ قلم کردیں او مصمم ارادہ تھا کہ ماہ مبارک رمضان ۱۴۳۸ھ سے قبل یہ منظر عام پر آجائیں، لیکن بسا اوقات انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا اس کے برعکس ہے۔ یہاں برمحل ہوگا اگر امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا قول نقل کر دیا جائے:

"میں نے خدا کو پہچانا، ارادوں کے ٹوٹ جانے سے"

اب خیال آتا ہے کہ "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا" اور باعثِ تاخیر میرے لیے خیر برکت، خوش نصیبی وسعادت کا ذریعہ ثابت ہوا۔ پس میں نے مناسب جانا کہ تتمہ کتاب پر یہ چند سطریں اضافہ کردی جائیں۔

شب ہائے شہادت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی آخری مجلس میں سلام پڑھ کر جب دبئی پہنچا تو ۲۲ ررمضان کو خوش خبری ملی کہ میرے صاحبزادے مشرف عباس نے عراق کے سفری انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ چنانچہ ۲۷ ررمضان المبارک ۱۰ بجے دن ہم نے نجف اشرف کی مقدس سرزمین پر قدم رکھا۔

برادرم ہادی عسکری جو طویل عرصے سے اپنے کاروباری سلسلے میں عراق میں سکونت پذیر ہیں، ہمہ وقت اُن کے لیے میری بے شمار دعائیں ہمیشہ رہیں گی۔ وہ اوّل تا آخر ہر قدم پر میرے ساتھ رہے اور جو سہولتیں انکے توسط سے میسر آئیں میری دعا ہے کہ ہر زائر کو یہ سہولتیں نصیب ہوں۔

نجف میں ہوٹل "قصرِ ذر" میں کمرے مخصوص تھے، یہ ہوٹل حرم امیر المومنین علیہ السلام کے مرکزی دروازے کے بالکل سامنے اور صبح اُٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے مولا کی خدمت میں سلام بجالاتا تھا۔ ہادی صاحب نے مجھے اچانک یہ نوید سنائی کہ ہفتہ ۲۴ رجون کی شب میں آپ کی ویڈیو ریکارڈنگ کا اہتمام حرم مطہر کے اندر کیا گیا ہے، میں مسرت آمیز حیرت زدہ تھا کہ مجھ خطاکار پر یہ مرحمتِ خاص، وقتِ مقررہ پر میں ہادی صاحب کے ہمراہ عتباتِ علویہ کے تشریفات جو معتبرین کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں ہم پہنچے ریکارڈنگ کے انتظامات مکمل تھے، گیارہ بجے سے بارہ بجے شب تک چار کلام پیش کیے اُن میں۔

۱:.....گرنے والے اب علیؑ کا نام لے — علامہ رشید ترابی

۲:.....کسی کے وقت کا تابع ہوں — علامہ رشید ترابی

۳:.....چراغ طور جلایا ہے، روشنی یوں ہے — علامہ رشید ترابی

۴:.....بزمِ اجمال میں تفسیر مفصل تھے حسینؑ — حضرت جوش ملیح آبادی

نجف اشرف اور مسجد کوفہ کی زیارات مکمل کر کے ۲۵ر جون اتوار کی شام ہم کربلا پہنچے اور حضرت ابوالفضلؑ کے روضے سے چند قدم کے فاصلے پر "جنت الحسین" میں قیام رہا۔ ہادی صاحب بھی ہمارے ہمراہ کربلا اور کاظمین بھی گئے۔ مولا کی عنایتوں اور ہادی صاحب کی محبتوں کے طفیل میرا جو استقبال اور عزت ملی اُسے قلم بند کرنا مشکل ہے، کاظمین میں حفاظتی انتظام بہت سخت ہوتے ہیں، مگر میری موٹر باب المراد جو حرم کا مرکزی دروازہ ہے اور عین روزے کے سامنے رُکی۔ حرمِ مطہر کے منتظمین جناب فراز صاحب سمیت دیگر افراد نے استقبال کیا۔

مجھے یہاں اپنے خیر مقدم سے جو عزت ملی اُسے قلم بند کرنا مشکل ہے وہاں سیکیوریٹی اتنی سخت ہوتی ہے کہ چڑیا پر نہیں مار سکتی اور روضے کے قریب تر کوئی سواری نہیں جا سکتی، لیکن ہم جس کار میں تھے وہ عین روضے کے سامنے پہنچائی گئی۔ مجھے یہ احترام و عزت اس لیے نصیب ہوا کہ خیر مقدم کرنے والے اپنے دل میں یہ جگہ رکھتے تھے کہ میں مولا کا مدح خواں اور شاعرِ اہلبیت ہوں۔ میں جب تک زندہ رہوں گا ان لمحات کو فراموش نہیں کر سکوں گا۔

کربلا چینل کے نمائندے نے عتبات الحسینیہ کے زیر اہتمام حرم سید الشہداء علیہ السلام میں بھی سلام پڑھنے کی ہادی عسکری صاحب سے فرمائش کی میں نے وہاں جو سلام پڑھے وہ یہ ہیں۔

۱:.....بابا میں کیا کروں — عزت لکھنوی

۲:.....اب آئے ہو بابا — شاہد نقوی

۳:.....ہائے وہ عصر کا ہنگام — پیام اعظمی

۴:.....تقدم ولدی — مولانا حسن امداد

ضریح شریف سید الشہداء کے داخلی دروازے پر میں نے تقدم ولدی پڑھا اور پشت پر میری ضریح امام حسین تھی، میں کیسے تحریر کروں کہ میرے اُس وقت کیا جذبات تھے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھ گنہگار کو یہ شرف بھی نصیب ہوگا کہ میں بیت سید الشہداء میں سلام

پڑھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا حسن امداد سمیت دوسرے شعراء کا جو کلام میں نے پڑھا بارگاہِ اہلبیت میں قبول ہے۔

اس سے بڑا شرف وسعادت میرے لئے کیا ہوسکتا ہے یقیناً یہ سیدۂ کونین سلام اللہ علیہا اور مولا علیہ السلام نے عطا کی اور میں اللہ سبحانہٗ کا شکر گزار ہوں۔

maablib.org

عکسِ تحریر

میری بیاض میں
اِن افراد نے تحریر کیں

خطیبِ عالم اسلام علامہ رشید ترابی
علامہ طالب جوہری
پروفیسر سردار نقوی
پروفیسر سبطِ جعفر (شہید)

maablib.org

حضرت علامہ رشید ترابی کا عکسِ تحریر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ رشید ترابی

چراغِ طور جلا ہے روشنی یوں سے
علی نے جلوہ دکھایا ہے روشنی یوں سے

رہا نظر میں کمی تھی مگر غمِ شبیر سے
اک روشنی سے آنکھوں میں آیا ہے روشنی یوں سے

تیری زمین میں رہا قبرِ شہ کے ماتم کا
یہ چراغ دل نے جلایا ہے روشنی یوں سے

جبیں پہ نامِ علی لکھ دیا تھا بچپن میں
وہ نقش ابھرا ہے آنکھ آیا ہے روشنی یوں سے

وہ جب سوا تو زمین حضرت سیدہ زمانہ بھر میں
کسی کا نام جو آیا ہے روشنی یوں سے

مرے حسین شبِ غم سحر ہو وقت سے
وہ نور عکس پہ چھایا ہے روشنی یوں سے

وفا کے نور سے روشن ہوئی شبِ عاشور
چراغ شہ نے بجھایا ہے روشنی یوں سے

سکینہ بی بی نے پوچھا تھا سب کو زندان میں
سرِ حسین جو آیا ہے روشنی یوں سے

چراغِ شامِ غریباں میں کس طرح جلتے
کسی نے گھر کو جلایا ہے روشنی یوں سے

رشید اب بھی ذرہ ذرہ کو کوئی تماشا دیکھے
علی غیاب میں سجدہ کیا ہے روشنی یوں سے

حضرت علامہ طالب جوہری کی منقبت کا عکسِ تحریر

Sat... MARCH 1976

Tuesday 2

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے امیرِ ابد اے سفیرِ ازل — [illegible] رسول
پیر اولوالعزم کی دیں کے نعم البدل — [illegible] کے پھل
اے خمیرِ مشیت کے [illegible] عمل

السلام

[illegible] — روح کا قافلہ گم رہا کا جرس
کتنی پیاسی ہے یہ سرزمینِ نفس — اے سحابِ مشیت کے پانی برس
کتنی دستاریں اللہ نے ہیں کاندھوں پہ بل

السلام

جب تو موسم کے تیور بگڑتے رہے — باد بانوں سے طوفاں جھگڑتے رہے
پھر بھی مانجھی سمندر سے لڑتے رہے — تم ترا نام لے کر اکڑتے رہے
پھر نہ پایا بدل موسم کی تیوری پہ بل

السلام

جیسے [illegible] باپ قربان ترے نام پر — آج پھر دین و مذہب [illegible]
[illegible] کا وارہ ہے اسلام پر — حق کو پھر سے ضرورت ہے [illegible]
اے عمل ہے خداوندِ ردِّ عمل

السلام

۱ شکر وہ کیسے کریں کس کا نہیں لگتی سمجھ

دشمنوں بات قوموں کی تو نہیں لگتی سمجھ

دیس فروشی کی خاطر دکھتی نہیں لگتی سمجھ

مسجدوں سے مسلسل آذان نہیں سمجھ

گم ہے دنیا سے آوازِ حی علی العمل

رسوائی

یوں تو ہر مردِ مومن خطا کار ہے

پھر بھی عفو در گزر کا سزاوار ہے

تیرے دربار کا سب کا جیا ہے تادار ہے

طالب حسین کا امیدوار ہے

واسطے سے رب خطاؤں کو کر دے بدل

اے ابو طالبِ ذی حشم کے پسر

اے ابو الائمہ اے مہدیِ منتظر

نوکِ نیزہ پہ ٹھہرا ہوا ایک سر

دستِ ہندہ میں حمزہ کا خونیں جگر

تجھ کو آواز دیتا ہے ہر ایک پل

جناب سردار نقوی کا عکسِ تحریر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یا علیؑ مدد

شبیرِ نبی وقارِ امامت شعار ہے
شبلِ علی یہ قربتِ پروردگار ہے
بعد از علی یہ دینِ خدا کا حصار ہے
یہ پنجتن کے باغ کی چوتھی بہار ہے
محبوبِ کبریا کے نواسے بھی آل بھی
سبطِ رسول بھی ہیں رسالت کے لال بھی

اغیار طعنہ زن تھے کہ ابتر ہیں مصطفیٰ
سرورؐ بلطفِ رحمتِ داور «
جس کا چمن نہ چھوڑے وہ گلِ تر «
رحمت پکاری صاحبِ کوثر «
سرچشمۂ بہارِ مسلسل یہ پھول ہے
ابتر وہ ہے جو دشمنِ آلِ رسولؐ ہے

دل تنگ تھے جو طعنۂ اغیار سے نبی
حل کی گئی بشارتِ کوثر سے کھل اٹھے
کوثر کی آبرو ہے وہ بیٹی رسول کی
اٹھ کر سلام کرتی ہے جسکو پیمبری
بیٹی کہ قلبِ پاکِ رسالت کا چین ہے
وہ ماں کہ جسکے لال حسنؑ و حسینؑ ہے
بنتِ رسولؐ آپ کی آغوش پر سلام — اس گود میں پلے ہیں زمانے کے دو امام
لازم شعورِ خلق پہ ہے اسکا احترام — اس گود سے حسد ہو تو تعلیل ہے حرام
اب جو بھی ہے نسب کی شرافت سے دور ہے
جو ان سے دور ہے وہ طہارت سے دور ہے

سبطِ جعفر شہید کا عکسِ تحریر

محشر جانے حیدرؑ جانے

حق کا شناور آلِ نبیؐ کو مصدر جانے محور جانے
انؑ کے عدو کو، ننگِ خلائق ابتر جانے بدتر جانے

ہستی اپنی عشقِ محمدؐ دولت اپنی حبِّ علیؑ
اس دولت کی قدر و فضیلت بوذرؓ جانے قنبرؓ جانے

پھر ستّھا حکمِ خدا تعالیٰ بی بی مریمؑ باہر جاؤ
پیرِ علیؑ کعبہ میں نیا در ! مادر جانے داور جانے

خارقۂ اعجازِ علیؑ ہیں مادر ہیں امّت تو نہیں
بنتِ اسدؑ کو فکر نہیں ہے اژدر جانے حیدرؑ جانے

فتح لکھی ہے دستِ خدا پر آپ بھی پیارے سچے نبیؐ
نادِ علیاً کہہ کے بلا لے خیبر جانے صفدرؑ جانے

بخٍ بخٍ کہہ تو رہا ہے بات تو حیب ہے دل میں علیؑ کو
بعدِ نبیؐ ہر ایک بشر سے بہتر جانے برتر جانے

میرا بھی ہے شافعِ محشر میں ہوں خجل اعمال سے اپنے
وہ مجبور مجھے اولاد نہ سمجھے نوکر جانے چاکر جانے

بندۂ حیدرؑ سبطِ جعفر لکھوا دینا میرے کفن پر
پھر مجھکو تشویش نہ دینا محشر جانے حیدرؑ جانے

جاناں نے تو مولا سے فتح کیا ہے کرب و بلا کو
[illegible] شاہ اور کو [illegible] جانے

[illegible]

میرے پسندیدہ

چند منتخب کلام

maablib.org

علامہ رشید ترابی

علامہ طالب جوہری (تبصرہ تقدیم ولدی)

مولانا حسن امداد

حضرت جوش ملیح آبادی

علامہ محمد مصطفیٰ جوہر

علامہ طالب جوہری

کلیمِ آلِ عباء جناب شاہد نقوی

جناب ساحر فیض آبادی

ڈاکٹر ہلال نقوی

علامہ رشید ترابی

جناب محشر لکھنوی

اشرف عباس

maablib.org

حضرت علامہ رشید ترابی مرحوم

ایک معرکتہ الآرا سلام

چراغِ نور جلایا ہے روشنی یوں ہے
علیؑ نے جلوہ دکھایا ہے روشنی یوں ہے

مری نظر میں کمی تھی مگر غمِ شہ سے
اک اشک آنکھ میں آیا ہے روشنی یوں ہے

تہِ زمیں بھی اُجالا ہے شہ کے ماتم کا
یہ داغ دل نے کمایا ہے روشنی یوں ہے

جبیں پہ نامِ علیؑ لکھ دیا تھا بچپن میں
وہ نقش اب ابھر آیا ہے روشنی یوں ہے

اندھیرا نزع میں رخصت ہوا، زباں پہ مری
کسی کا نام جو آیا ہے روشنی یوں ہے

مری حیاتِ شبِ غم سہی مودت ہے
وہ نور فکر پہ چھایا ہے روشنی یوں ہے

وفا کے نور سے روشن ہوئی شبِ عاشور
چراغ شہ نے بجھایا ہے روشنی یوں ہے

سکینہ بی بی نے پہچانا سب کو زنداں میں
سرِ حسینؑ جو آیا ہے روشنی یوں ہے

چراغ شام غریباں میں کس طرح جلتے
کسی کے گھر کو جلایا ہے روشنی یوں ہے

رشیدؔ اب نہ ڈرائے گی کوئی تاریکی
علیؑ نے پاس بلایا ہے روشنی یوں ہے

maablib.org

نظم تقدم ولدی پر تبصرہ

علامہ طالب جوہری

علامہ طالب جوہری مولانا حسن امداد کی کتاب لوالحمد میں فرماتے ہیں

تقدم ولدی بڑی مکمل اور بھرپور نظم ہے اسکا مرکزی خیال سید الشہداء کا وہ حکم ہے جو نظم کا عنوان ہے۔ اگرچہ جناب علی اکبر کا مرحلہ شہادت اختلافی ہے لیکن جس مرحلے کو سامنے رکھ کر یہ نظم لکھی گئی ہے، اُس کے جواز اور پس منظر کی اس سے بہتر عکاسی اردو کے رثائی ادب میں کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اس نظم میں جتنی گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے وہ صرف شاعری کے بس کی بات نہیں ہے، جب تک کہ مقتل پر پوری نگاہ نہ ہو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس طرح نفسیات کے ایسے لطیف رخ ہیں جو کم نظیر ہیں۔ حسینؑ اور اکبرؑ باپ اور بیٹے بھی ہیں، نائب رسولؐ اور شبیہ رسولؐ بھی ہیں اور امام و ماموم بھی ہیں ان ساری اضافتوں کا بین السطور میں لطیف ترین اظہار پایا جاتا ہے۔

تقدم ولدی

مولانا حسن امداد (مرحوم)

کربلا ہوچکی تیار تقدم ولدی
بڑھے آتے ہیں جفا کار تقدم ولدی
چاروں جانب سے ہے یلغار تقدم ولدی
ہوتی ہے تیروں کی بوچھار تقدم ولدی

زد پہ ہیں سب میرے انصار تقدم ولدی
ان پہ آنچ آئے نہ زنہار تقدم ولدی

وقت یہ وہ ہے کہ تلوار اٹھالیں ہم لوگ
دین حق کو کسی صورت سے بچالیں ہم لوگ
کیوں کسی اور پہ اس بار کو ڈالیں ہم لوگ
کیوں نہ یہ معرکہ خود آپ سنبھالیں ہم لوگ

کھینچ کر نیام سے تلوار تقدم ولدی

لشکر شام کو بڑھنے کی اجازت کیوں دیں
روک دیں دور قریب آنے کی مہلت کیوں دیں
ہم پہ زغہ کریں اتنا انہیں فرصت کیوں دیں
اور اسکے لئے اصحاب کو زحمت کیوں دیں

یہ مناسب نہیں زنہار تقدم ولدی

اے میرے لختِ جگر، اے میرے پیارے فرزند
ہیں یہ نولاکھ تو کیا عزم تو ہے اپنا بلند
آگے آگے صفِ اول کے رہے اپنا سمند
میرے اصحاب کو پہنچے نہ کہیں کوئی گزند

تیر آتے ہیں لگا تار ، تقدم ولدی

بھائی عباس سنبھالے رہیں لشکر کا نظام
قاسم وعون ومحمد رہیں نزدیکِ خیام
تاکہ اس سمت کا رخ کرنہ سکے لشکرِ شام
اور تم بہر وغا آگے بڑھو لے کے حسام

تیرا اللہ مددگار ، تقدم ولدی

دین نانا کا مٹے اور نواسہ سہہ لے
یہ نہ ہوگا کبھی ہم سے کوئی کچھ بھی کہہ لے
خون بہتا ہے تو ہم لوگوں کا اس پہ بہہ لے
بھیجتا جنگ پہ عابد کو میں تم سے پہلے

گر عابد تو ہے بیمار ، تقدم ولدی

مجھ سے یہ چاہتے ہیں بدر و احد کا بدلہ
میرے اسلاف کی ہر جد و جہد کا بدلہ
دینِ اسلام کی نصرت کا مدد کا بدلہ
باپ سے تیرے یہ لیں گے تیرے جد کا بدلہ

ہم ہیں اسکے لئے تیار ، تقدم ولدی

ہم کو تاریخ بدل دینی ہے دشت و در کی
پڑے آئندہ نظر جس پہ زمانے بھر کی
گر ضرورت ہو تو بازی بھی لگا دو سب کی
آخری جنگ سمجھ لو اسے اپنے گھر کی

جانے پھر کب کھنچے تلوار ، تقدم ولدی

کہیں ایسا نہ ہو اصحاب نہ جانے دیں تمہیں
جوڑ کر ہاتھ نہ تلوار اُٹھانے دیں تمہیں
پاؤں تھامیں قدم آگے نہ بڑھانے دیں تمہیں
روک لیں برچھیاں میدان میں نہ کھانے دیں تمہیں

ہیں یہ حد درجہ وفادار ، تقدم ولدی

کہیں ایسا نہ ہو عباس علی بطلِ جلیل
اسطرح دیکھ کے بربادی گلزارِ خلیل
تم سے پہلے ہی وہ کر جائیں وغا میں تعجیل
کر کے قاسم کے حوالے علمِ فوجِ قلیل

خود بڑھیں تول کے تلوار ، تقدم ولدی

کہیں ایسا نہ ہو سب کو خبر ہو جائے
اور طلب عون و محمد کی اُدھر ہو جائے
تاروں کو اذنِ سفر قبلِ قمر ہو جائے
میری ترتیب ہی سب زیر و زبر ہو جائے

ہو سکے گا ہم سے نہ انکار ، تقدم ولدی

اُمِ لیلیٰ درِ خیمہ سے کہیں دیکھ نہ لیں
رُخ تمہارا ہے سوئے فوجِ لعیں دیکھ نہ لیں
ابر میں جاتے ہوئے ماہِ مبین دیکھ نہ لیں
شیر کو نیزوں کے جنگل کے قریں دیکھ نہ لیں

پھر تو جانا بھی ہے دشوار ، تقدم ولدی

جوش ملیح آبادی (مرثیہ سے اقتباس)

بزمِ اجمال میں تفسیرِ مفصل تھے حسینؑ
طاعتِ متصل و حمدِ مسلسل تھے حسینؑ
شاہدِ گلبدنِ حجلۂ مقتل تھے حسینؑ
ہادیٔ پختہ و انسانِ مکمل تھے حسینؑ
سایۂ تیغ میں بھی درسِ وفا دیتے تھے
انتہا یہ ہے کہ قاتل کو دعا دیتے تھے

نازشِ نوعِ بشر فخرِ اب وجد تھے حسینؑ
مفرد و مستند و اشرف و امجد تھے حسینؑ
سجدہ کرتا تھا جدھر کعبہ وہ معبد تھے حسینؑ
نقطۂ پختگیٔ فکرِ محمدؐ تھے حسینؑ
یہ نہ ہوتے تو یقیں صیدِ گماں ہو جاتا
آخری شعلۂ پیغام دھواں ہو جاتا

جگرِ ختمِ رسل جانِ علیؑ شمعِ بتولؑ
خاورِ جود و کرم داورِ اقدار و اصول
موت کو گردِ قدم مل نہ سکی وہ مقتول
خاتمِ حق کے نگیں دینِ شہادت کے رسول
مثلِ شبیرؑ جنھیں پاسِ وفا ہوتا ہے
ایسے بندوں ہی کے پردے میں خدا ہوتا ہے

آپ کیا آئے کہ پیغام بہاراں آیا
دشتِ پُر خار میں زہرًا کا گلستاں آیا
مردہ ذرّوں کی طرف چشمہ حیواں آیا
اُفقِ مصر پہ گویا مہِ کنعاں آیا

سورما رن میں بصد شان تفاخر آئے
جن کی عادت ہے شہادت وہ بہادر آئے

فوج نے آلِ محمدؐ پہ جو روکا پانی
پیاس کے ابر سے یوں ٹوٹ کے برسا پانی
بے دھڑک قصرِ حکومت میں در آیا پانی
ہو گیا سر سے شہنشاہ کے اونچا پانی

تاجداری مع اورنگ و نگیں ڈوب گئی
آسماں سے جو لڑی تھی وہ زمیں ڈوب گئی

قطرۂ دل میں لئے ایک سمندر تھے حسینؑ
ذاتِ واحد میں سمیٹے ہوئے لشکر تھے حسینؑ
دین آدابِ رفاقت کے پیمبر تھے حسینؑ
جان دینے پہ جب آئے تو بہتر تھے حسینؑ

سرفرشتوں کے یہاں آج بھی خم ہوتے ہیں
ایسے انسان رسولوں میں بھی کم ہوتے ہیں

حضرت مولانا محمد مصطفٰے جوہر

سلام

حسینؑ ابن علیؑ کا غم دلِ مضطر میں رہتا ہے
بہ ہر عنوان جیسے گھر کا مالک گھر میں رہتا ہے

غمِ شبیرؑ اور حُبِ علیؑ ہے زندگی اپنی
یہ جذبہ دل میں رہتا ہے یہ سودا سر میں رہتا ہے

سنے گا پوچھنے والے طہارت دیدۂ ترکی
یہ آنسو سیّدہ کے گوشۂ چادر میں رہتا ہے

کسی صورت علیؑ کے در پہ رہنے کی جگہ ملتی
یہ خورشید ضیاء گستر اسی چکر میں رہتا ہے

نکلتا ہی نہیں بغض علیؑ دشمن کے سینے سے
یہ مرحب دوسرا ہے جو اسی خیبر میں رہتا ہے

فراری سے نہ یہ پوچھو کہ آخر بھاگتا کیوں ہے
یہ پوچھو بھاگنا طے ہے تو کیوں لشکر میں رہتا ہے

کبھی پہلو میں ڈھونڈا اور کبھی روئیں رباب اٹھ کر
یہ عالم رات بھر یادِ علیِ اصغر میں رہتا ہے

بیانِ معرفت میں صدق سے ہٹتا نہیں جوہرؔ
دماغ اس کا خیالِ رفعتِ منبر میں رہتا ہے

علامہ طالب جوہری

سلام

ہم کو کرسی نہ جاہ و حشم چاہیے ہم کو دولت نہ دولت سرا چاہیے
وہ خدا جو محمدؐ کی پہچان ہے اُس خدا کی اک ادنیٰ رضا چاہیے

لوگ منزل کی جانب چلے تھے مگر بے یقینی کے جنگل میں گم ہو گئے
کون ان کو بتائے کہ اس راہ میں آج بھی معتبر رہنما چاہیے

یہ علیؑ ولی یہ رجل یہ وصی سب کا مولا بھی ہے کُل ایمان بھی
جتنے ممکن تھے الفاظ سب کہہ دیئے ناشناساؤں کو اور کیا چاہیے

لفظ مولا کے بائیس معنی سہی لفظِ بخٍ کے معنی معین کرو
کلمہ گویوں کے اس حرفِ تبریک پر آپ کو بھی تو کچھ پوچھنا چاہیے

انقلابِ زمانہ تجھے کیا کہوں جسکی پرچھائیں سورج نے دیکھی نہ تھی
شام کے اک نحوست بھرے شہر میں اس کی بیٹی کے سر کو ردا چاہیے

شمع جب خیمۂ شاہ میں گل ہوئی نور پھیلا امامت کی آواز کا
وہ چلا جائے جس کو بچانی ہو جاں وہ رُکے جسکو آبِ بقاء چاہیے

کلیمِ آلِ عباء حضرت شاہد نقوی

سلام

ہر مشکل میں دافعِ مشکل پرچم حیدرؑ آج بھی ہے
دونوں جہاں میں قوم کا رہبر قوم کے سر پر آج بھی ہے

کس سے پوچھیں کیوں یہ لبوں پر اور کسی کا نام نہیں
نامِ علیؑ کی گونج فضا میں لشکر لشکر آج بھی ہے

سات سو منبر قدحِ علیؑ میں برسوں تک مشغول رہے
ٹوٹ گئے وہ سارے منبر مدحتِ حیدرؑ آج بھی ہے

ہم وہ نہیں جو رخ پہ ہوا کے اپنا کعبہ بدلتے ہیں
حیدرؑ حیدرؑ کل بھی تھا لب پر، حیدرؑ حیدرؑ آج بھی ہے

لب پر بخن ہاتھ میں پتھر یہ تاریخ گزشتہ تھی
نامِ علیؑ پر بخن بخن ہاتھ میں پتھر آج بھی ہے

کل بھی ان کے در پہ فرشتے بن کے سوالی آتے تھے
اہلِ طلب کی منزل آخر خانہ حیدرؑ آج بھی ہے

جہل کے پیکر ناچ رہے ہیں بابِ علم کے منبر پر
ان کو شاید علم نہیں ہے وارثِ منبر آج بھی ہے

جناب نصیر ترابی

سلام

یہ تیغ یہ کتاب یہ سجدہ علیؑ سے ہے
اسلام تیرے گھر میں اُجالا علیؑ سے ہے

ہم پر لگے نہ کفر کا فتویٰ تو ہم کہیں
کس کس کا نام دہر میں زندہ علیؑ سے ہے

منہ پھیر کے جو قبلہ ایماں سے آئے ہیں
شاید انھیں خبر نہیں کعبہ علیؑ سے ہے

اے دینِ مصطفےٰ تو کبھی فیصلہ تو کر
خود چل پڑا ہے نام ترا یا علیؑ سے ہے

ہم سے نہ پوچھ ہم تو مودت کے لوگ ہیں
قرآں تجھے بتائے گا کیا کیا علیؑ سے ہے

تم کو ہماری فکر ہے کیوں اے نماز یو
ہم جانیں جو حساب ہمارا علیؑ سے ہے

عابدؑ کی بیکسی نے بھی ثابت یہ کر دیا
تاحشر بیکسوں کا سہارا علیؑ سے ہے

اپنا حریف شہر میں اب کون ہو نصیر
ہم اس کے دوست ہیں جو شناسا علیؑ سے ہے

جناب ساحر فیض آبادی

سلام

فخرِ رسولؑ دوسرا نازشِ کبریا حسینؑ
شاملِ انما حسینؑ داخلِ ھل اتیٰ حسینؑ

بخش دی اہلِ درد کو تو نے عجب دوا حسینؑ
مرہم زخمِ زندگی اب ہے تری عزا حسینؑ

بن گئی ارضِ کربلا عکس نمائے خیر و شر
تیرا لہو بنا گیا دشت کو آئینہ حسینؑ

لے کے ابد کی زندگی آئے تھے کربلا حسینؑ
دینِ خدا کو دے گئے جینے کا حوصلہ حسینؑ

مجھ پر کھلے کچھ اس طرح معنیِ کربلا حسینؑ
جیت گئے ترے چراغ ہار گئی ہوا حسینؑ

حیدریم قلندرم بادلِ وجاں حسینئ ام
نعرہ مرا ہے یا علیؑ میری پکار یا حسینؑ

دیکھا ہے چشمِ دہر نے آدمی آدمی کا فرق
ظلم کی انتہا یزید ، صبر کی انتہا حسینؑ

میں کہ غبارِ راہ تھا تو نے کیا ہے کیمیا
عزت و شہرت و شرف سب ہے تری عطا حسینؑ

میں بھی گناہ گار ہوں میں بھی خطا شعار ہوں
مجھ پر بھی اک نگاہ کر مجھ کو بھی حر بنا حسینؑ

سجدہ تو تجھ کو اے خدا کر گیا شاہِ کربلا
اب کہاں ایسی بندگی اب کہاں دوسرا حسینؑ

ماں کھڑی دیکھتی رہی تیرے کمالِ صبر کو
تو نے جوان لال کا لاشہ اٹھا لیا حسینؑ

ساحرؔ اس اہتمام سے کاش اٹھوں میں روزِ حشر
آنکھوں سے اشک ہوں رواں وردِ زباں ہو یا حسینؑ

maablib.org

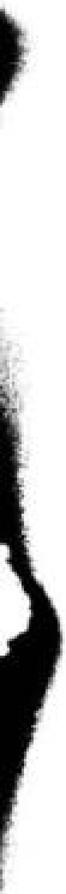

ڈاکٹر ہلال نقوی

سلام

اظہارِ صدق و حق جو کہیں برملا نہیں
انسانیت ہزار سہی ، حوصلہ نہیں

جس کے نصاب میں ہو کتابِ غضنفری
وہ مدرسہ جہاں میں بجز کربلا نہیں

آبِ بقا کے ابر سے سیراب ہوگئے
پیاسا تو ابنِ ساقیِ کوثر رہا نہیں

مانا کہ خوں میں بھر گیا اکبر کا بانکپن
لیکن شبابِ دینِ محمدؐ مٹا نہیں

بازو علَم کے واسطے کاٹے گئے مگر
کس دور میں حسینؑ کا پرچم اٹھا نہیں

مانا کہ سر سے چھین لیں اعدا نے چادریں
لیکن سرِ تقدسِ عترت کھلا نہیں

بچوں کے دل تو شامِ غریباں میں بجھ گئے
لیکن چراغ ، منزلِ حق کا بجھا نہیں

قاسم کی ناتمام جوانی کو روند کر
فوجوں کے سر پہ فتح کا سہرا بندھا نہیں

حُر بھی ہوا شہید مگر آج بھی ہلال
باطل سے آنے والا مجاہد رکا نہیں

جناب محشر لکھنوی

سلام

اے خدا عشق کا عرفان کہاں سے لاؤں
جو تری حمد کی ہے شان کہاں سے لاؤں

نعمتِ حق کا بھلا شکر ادا ہو کیسے
مدحتِ سورۂ رحمٰن کہاں سے لاؤں

دل یہ کہتا ہے کہ اشعار ہوں شایانِ علیؑ
میں فرزدق کا قلمدان کہاں سے لاؤں

ذات میں جس کی نظر آئے نصیری کو خدا
ایسے اوصاف کا انسان کہاں سے لاؤں

کُلِ ایمان بھی اور نازشِ ایمان بھی ہو
جز علیؑ ایسا مسلمان کہاں سے لاؤں

لفظِ مولا نہ سمجھ میں تری آیا اب تک
لفظ اس سے کوئی آسان کہاں سے لاؤں

ایک ایمان تھا سو ہو گیا وقف مولا
غیر پر لانے کو ایمان کہاں سے لاؤں

جب کہو تم کو نبی دیدوں تمہارے جیسا
دونوں عالم کا میں سلطان کہاں سے لاؤں

جس میں ہو آیۂ تطہیر نہ شامل واعظ
وہ ترے واسطے قرآن کہاں سے لاؤں

ذکرِ مولا کے سبب لوگ مجھے جانتے ہیں
اس سے بہتر کوئی پہچان کہاں سے لاؤں

بولے اکبر کو یہ سینے سے لگا کر شبیرؑ
پانی دو گھونٹ مری جان کہاں سے لاؤں

رکھ کے سر خاک پہ کہتی تھی یہ رو کر زینبؑ
اپنی چادر کا نگہبان کہاں سے لاؤں

ذکرِ مولا میں ہواؤں میں بھی کرتا محشر
کیا کروں تختِ سلیمان کہاں سے لاؤں

اشرف عباس

سلام

زندگی غم ہے علاجِ درد و غم عباس ہیں
سوکھے کھیتوں کے لئے ابرِ کرم عباس ہیں

کہہ کے یا عباسؑ ہم جب بھی اٹھاتے ہیں علم
ایسا لگتا ہے ہمارے ہم قدم عباسؑ ہیں

ان کے بھائی تو امامِ وقت ہیں اُن کے سوا
عالمِ انسانیت میں کس سے کم عباسؑ ہیں

دونوں بازو کٹ گئے کٹ جائیں اس سے کیا ہوا
ہے علم اونچا کہ سرتاپا علم عباسؑ ہیں

ہم کو کیا معلوم دنیائے وفا کی وسعتیں
ہم نہ عمراںؑ ہیں نہ ہم حیدرؑ نہ ہم عباسؑ ہیں

ہم انھیں معصوم کہنے سے تو قاصر ہیں مگر
برتر از امکان لغزش کم سے کم عباسؑ ہیں

کہہ رہا ہے آج بھی اشرفؔ علم عباسؑ کا
پردۂ کعبہ نگہبانِ حرم عباسؑ ہیں

اس کے علاوہ بے شمار سلام ہیں جو اُردو ادب کے بے مثال شاہکار کہے جاسکتے ہیں، اختصار کے پیش نظر انھیں نقل نہیں کر رہا ہوں ان کے حسن کلام، خوبصورت تخیل اور دیگر کاوشوں سے نہ صرف یہ کہ کوئی انکار نہیں کرسکتا بلکہ وہ آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں تقدم دلدی۔ ۱۴ ر صدیاں بیت گئیں۔ زیارت ناحیہ کا منظوم ترجمہ۔ اٹھو حسینؑ عابدؑ بیمار آئے ہیں اور دیگر۔

عبادتوں کا تسلسل ہے تاحیات چلے
سو آج منقبت و نعت ساتھ ساتھ چلے
نہ ذکرِ نفسِ نبیؐ ہو تو کیا مزا شاہد
رُکے گی آ کے علیؑ پر کہیں سے بات چلے
(شاہد جعفر)

اثر جاتا رہا لفظوں سے یا خوف خدا دل سے
سبب کیا ہے کہ سچی بات بھی اچھی نہیں لگتی
غم شبیرؑ میں سب کچھ گوارا ہے مگر ہم کو
غم شبیرؑ کی سوداگری اچھی نہیں لگتی
(ساحر فیض آبادی)

تصاویر

maablib.org

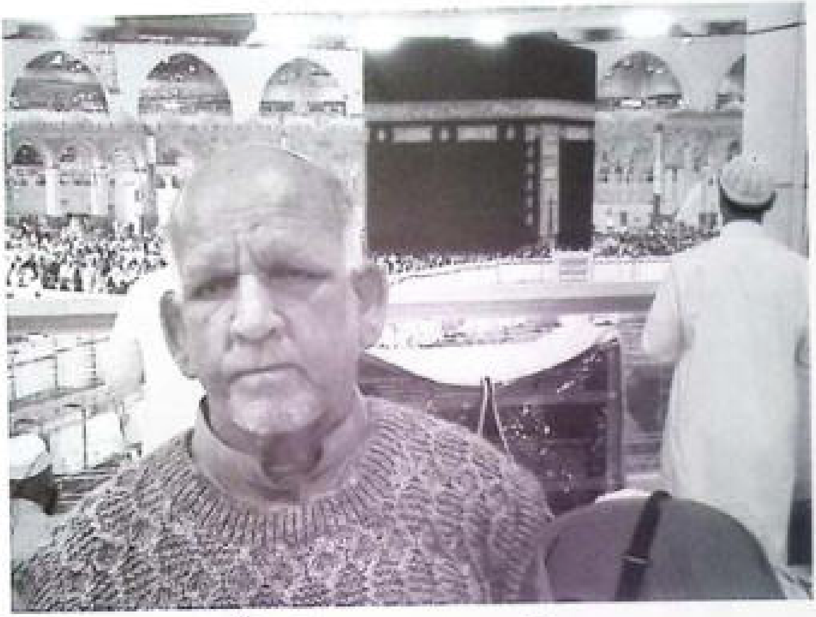

جناب اشرف عباس صاحب (مکہ معظمہ)

جناب اشرف عباس صاحب (امیر المومنین امام علی ابن ابی طالب کے حرم کا منظر)

جناب اشرف عباس صاحب سید الشہداءؑ کے حرم میں سلام مرحمت فرمارہے ہیں

جناب اشرف عباس صاحب دبئی میں اپنی قیام گاہ پر علامہ طالب جوہری کیساتھ غیررسمی نشست

علامہ رضی جعفر نقوی اور جناب اشرف عباس

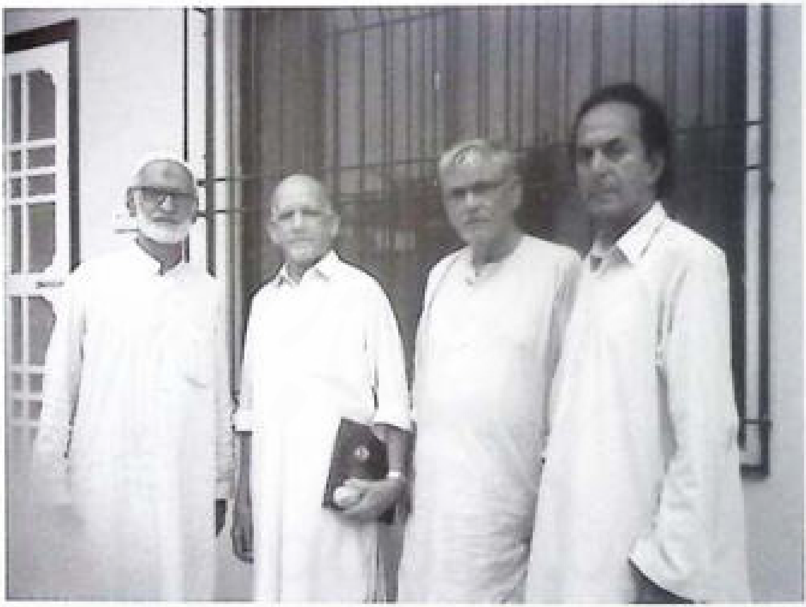

ڈاکٹر ہلال نقوی، یداللہ حیدر، اشرف عباس، انیس عباس رضوی

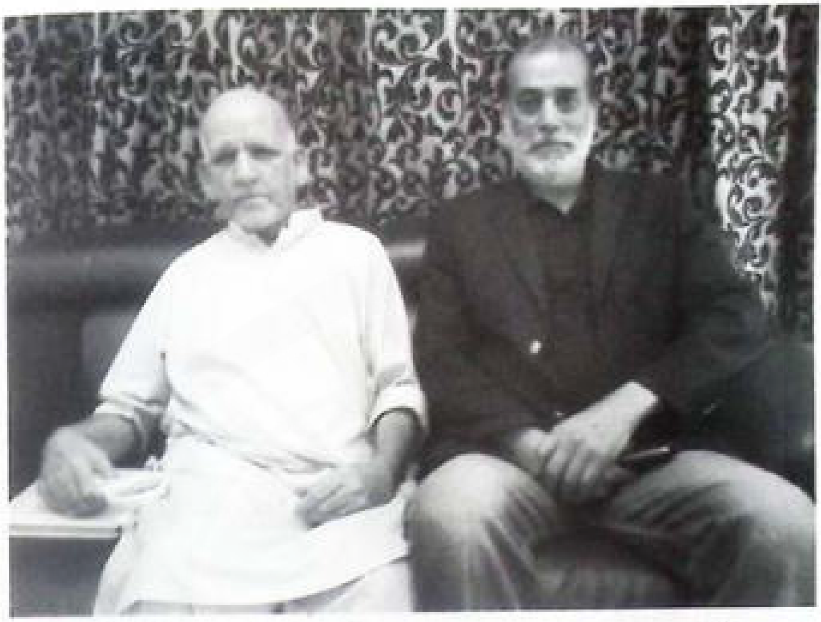

جناب اشرف عباس صاحب اپنے دوست میجر (ر) اعجاز مصطفےٰ کے ساتھ

جناب اشرف عباس منقبت پیش کر رہے ہیں

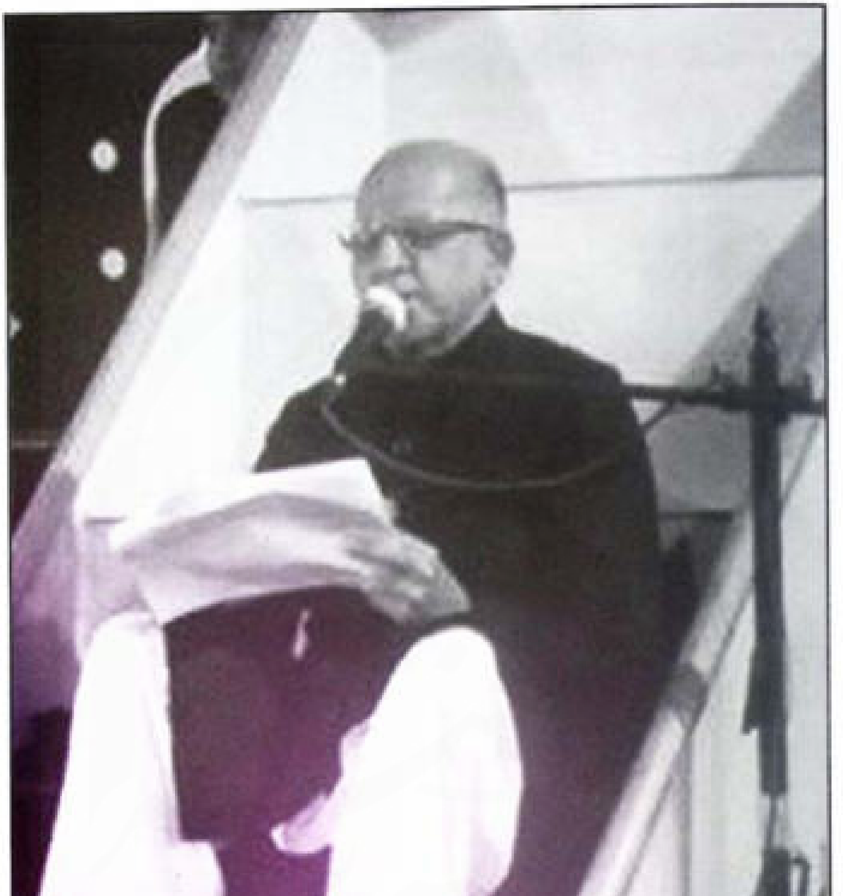

جناب اشرف عباس صاحب نشتر پارک میں سلام پیش کر رہے ہیں

علامہ طالب جوہری

ناصر جہاں مرحوم کی رثائی آواز کے علاوہ یہ دوسری زندہ رثائی آواز ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ رثائیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے لحن کا انتخاب جو رثائیت کو چار چاند لگا دے۔ اس کے ساتھ ہی لفظوں کی ایسی ادائیگی کہ سامع پر شعر کی مکمل ترسیل ہو جائے، اشرف عباس کا وہ طریقہ ہے جو محافل، مشاعرے اور مجالس میں سلام خوانی تک ہر جگہ مرغوب و مطلوب ہے۔

علامہ رضی جعفر نقوی صاحب

یہ کتاب اُن تمام لوگوں کیلئے ایک گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو بزرگان ملت کے حالات سے واقفیت کا شرف رکھنا چاہتے ہوں۔

افتخار عارف

بڑی جزا ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے ذکر حسینؑ کو بلند رکھا ہے۔ مظلوم کی آواز اور فکر حسینی کو عام کرنے والی آوازوں میں اور سلام خوانی کے ذیل میں برادر اشرف عباس صاحب یکتا نظر آتے ہیں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ انکا ثانی اب تک اس عزائی تربیت کیساتھ منظر عام پر نہ آسکا آپکی منبر پر نشست، تن پوشی لباس وغیرہ انکی صفات میں نظر آتی ہیں۔